Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1959ء

بہترین اور بدترین حاکم

حضرت عوف بن مالک (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا کہ تمہارے سب سے بہتر حاکم وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ تم ان کے لئے دعا کرو اور وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔

(مسلم۔ بحوالہ ریاض الصالحین)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون :- ۷۵۰۰	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
خط و کتابت کا پتہ :- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵- بی- گلبرگ کالونی لاہور	ہندوستان اور پاکستان سے بارہ آنے	ہندوستان اور پاکستان سے :- آٹھ روپے غیر ممالک سے :- ۱۴ شلنگ

جلد ۱۲ ‖ اگست ۱۹۵۹ء ‖ نمبر ۸

— فہرستِ مضامین —

لمعات	۲ — ۱۶	باب المراسلات	۵۹ — ۶۱
		(نظامِ ربوبیت میں جبر)	
مجلسِ اقبال	۱۷ — ۲۷	حقائق وعبر	۶۲ — ۷۱
احباب سے ذاتی اپیل	۲۸ — ۲۹	۱- تیر و نشتر	
(محترم پرویز صاحب)		۲- شاہ سعود کا قابلِ گرفت "جرم"	
تفسیر المنار	۳۰ — ۴۰	۳- قرآن اپنوں اور غیروں کی نظر میں	
(علامہ مفتی محمد عبدہٗ - مرحوم)		لوگوں کو دھوکا نہ دیجئے	۷۳ — ۷۵
اشتراکیت اور اسلام	۴۱ — ۴۰	(الفیرہ ٹیلور سے خطاب)	
اسلام کی سرگزشت	۴۹ — ۵۷		

رابطۂ باہمی ۷۶ — ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اسلامی آئین کے دو ستون

سال گذشتہ کے عسکری انقلاب کے بعد، صدرِ مملکت جنرل محمد ایوب خان صاحب کی طرف سے، مختلف تقاریب پر جن خیالات کا اظہار وقتاً فوقتاً ہو رہا ہے۔ وہ بڑے حوصلہ پرور اور امید افزا ہیں۔ اگر پاکستان کا آئین، ان خیالات کا آئینہ دار ہو گیا تو کاروانِ ملت یقیناً اُس منزل کی طرف گامزن ہو جائے گا جس کے حصول کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ انھوں نے، گذشتہ مئی میں، شتروالہ بار کے مقام پر، علما حضرات سے جو خطاب کیا تھا، اس کا تفصیلی تذکرہ اور تبصرہ، طلوعِ اسلام کی جون کی اشاعت میں سامنے آ چکا ہے۔ اس کے بعد، انھوں نے ۶ر جولائی کو مری کی گل پوش فضاؤں میں، کمشنروں کی کانفرنس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہر صاحبِ فکر و بصیرت کو دعوتِ غور و تدبر دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔

دو اہم مسائل

> ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیلوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں اور اس (آئیڈیالوجی) کی تشریح و تفسیر عصرِ حاضر کی زبان میں، زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کو روحِ اسلام سے کشید کیا جائے اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ فکر و نظر حضرات کو دعوتِ فکر و نظر دی جائے کہ وہ (زندگی کے مسائل کا) نہایت معقول حل دریافت کریں۔
>
> دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ، ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ حاصل ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ ۸ر جولائی ۱۹۵۹ء)

ہم اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق، بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ صدرِ محترم نے اپنے مختصر سے بیان میں، ان دو ستونوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جن پر دین کی عمارت استوار ہے اور جنھیں قرآن نے "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کی جامع

دین کے دو ستون

اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے "الصلوٰۃ" (یعنی زندگی کے ہر گوشے میں قانونِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلنا، مومن کا دستورِ حیات اور نہجِ زندگی ہے اور "الزکوٰۃ" (نوعِ انسانی کے لئے سامانِ نشو و نما کی فراہمی)، اس دستورِ حیات کا لازمی تقاضا اور فطری نتیجہ۔ الدین (اسلامی نظامِ زندگی) کے یہی وہ دو ستون ہیں جن کے متعلق طلوعِ اسلام پہلے دن سے آج تک مسلسل و متواتر لکھتا چلا آرہا ہے۔ مجلہ طلوعِ اسلام کے ہزارہا اوراق اور اس کی طرف سے شائع کردہ بے شمار پمفلٹ اور مستقل تصانیف اسی اجمال کی تفصیل اور اسی نظام کے مختلف گوشوں کی توضیح و تبیین پر مشتمل ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس کی تشکیل کی خاطر ہم نے پاکستان کو حاصل کیا تھا اور اسی کے قیام کی جد و جہد کے لئے ہماری زندگی کا ہر لمحہ وقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے صدرِ محترم کے ان خیالات کو اس درجہ امید افزا اور حوصلہ پرور قرار دیا ہے۔

شقِ اوّل کے اجزائے ثلاثہ

صدرِ مملکت نے پہلی شق میں جس حقیقت پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ

(۱) اسلام کی اس آئیڈیالوجی کا تعین کیا جائے جو تمام مسلمانانِ پاکستان کیلئے بطور قدرِ مشترک قابلِ قبول ہو۔

(۲) اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تبیین، علم و بصیرت اور عقل و دانش کی روشنی میں، عصرِ حاضر کی علمی سطح کے مطابق کی جائے۔ اور

(۳) اس آئیڈیالوجی کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کا معقول حل تلاش کیا جائے۔

یہ تینوں اجزاء جن سے شقِ اول ترتیب پاتی ہے، اربابِ بصیرت کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

مشترک آئیڈیالوجی کا تعین

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی آئیڈیالوجی متعین کی جاسکتی ہے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک، بطور قدرِ مشترک قابلِ قبول ہو؟ جہاں تک ہمارے قدامت پرست مذہبی حلقہ (علماء حضرات) کا تعلق ہے، اس سوال کا جواب نفی ——— اور حتمی اور یقینی طور پر نفی ——— میں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسا کہنے سے یہ حضرات بڑے طیش میں آجاتے ہیں اور ہر طرف سے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ ہمارا باہمی اختلاف (جسے اس قدر اچھالا جاتا ہے)، صرف فروعات میں ہے۔ اصولی طور پر ہم میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن جو لوگ ان مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں وہ بادنیٰ تعمق اس حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں کہ یہ حضرات، اسلام کا کوئی ایسا تصور متعین نہیں کر سکتے جو ان سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ یہ ناممکن ہے اور اس کی عملی شہادت (فساداتِ پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی ——— یعنی) منیر کمیٹی کی رپورٹ ہے۔ اس میں ان حضرات سے پوچھا یہ گیا تھا کہ مسلمان کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا ماحصل یہ تھا کہ کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا یہ ظاہر ہے کہ اس سوال کا تعلق دین کی فروعات سے نہیں تھا اصول سے تھا۔ اور اصول بھی ایسا جو بنیادی اور اساسی

حیثیت رکھتا ہے۔ سو جو لوگ متفقہ طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں، وہ متفقہ طور پر یہ کیا بتائیں گے کہ اسلام کیا ہے؟ اس کا مزید ثبوت درکار ہو تو آپ ایک کمیشن مقرر کر دیجئے جو ان حضرات سے یہ دریافت کرے کہ اسلامک آئیڈیالوجی کسے کہتے ہیں۔ ان کے جوابات خود بتا دیں گے کہ حقیقتِ حال کیا ہے!

علما میں اتفاق ناممکن ہے

جب (مرحوم) آئینِ پاکستان زیرِ تدوین تھا تو ان حضرات کا متفقہ مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کا آئین، کتاب و سنت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اسی مطالبہ کی بنا پر انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ دیکھئے! ہم نے کس طرح ایک متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن اسی مطالبہ کی اگلی شق یہ تھی کہ ہر فرقہ کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ "کتاب و سنت" کی تعبیر اپنے مسلک کے مطابق کرے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس متفق علیہ مطالبہ کی حقیقت کیا تھی؟ حقیقت صرف اس قدر تھی کہ یہ ایک اصطلاح تھی جسے ان حضرات نے متفقہ طور پر اختیار کیا تھا۔ (یہ اصطلاح بھی بہت پرانی ہے)۔ لیکن اس اصطلاح کا مفہوم ہر فرقہ کے نمائندہ کے نزدیک مختلف تھا۔ اس اتفاق و اتحاد کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک ہندو کہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور ایک مسلمان کہے کہ میں بھی خدا کو مانتا ہوں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دونوں خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن جب ان سے خدا کا مفہوم دریافت کیا جائے تو وہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوگا۔ اگر آپ کو اس کا ثبوت مطلوب ہو کہ مختلف فرقوں کے علماء کے نزدیک "کتاب و سنت" کا مفہوم کس قدر مختلف ہے تو اس کا طریقہ نہایت آسان ہے۔ حکومت سے کہیئے کہ وہ ایک مختصر سا سوالنامہ مرتب کرے جس میں صرف اتنا پوچھا جائے کہ

(۱) سُنّت کی تعریف (Definition) کیا ہے۔

(۲) وہ کونسی کتاب ہے جس میں رسول اللہ کی سُنّت قطعی اور یقینی طور پر صحیح صحیح درج ہے۔

(۳) کیا یہ کتاب تمام فرقوں کے نزدیک یکساں طور پر واجب التسلیم اور قابلِ قبول ہے۔ اگر نہیں، تو کیا کوئی اور ایسی کتاب ہے جو سب کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔

اس سوالنامہ کے جو جوابات موصول ہوں وہ خود بتا دیں گے کہ ان حضرات کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے کہ ہمارے اختلافات فرعی ہیں۔ اصول میں ہم سب متفق ہیں۔

طلوعِ اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ

چونکہ بات سامنے آگئی ہے اس لئے ضمناً اتنا بتا دینا غیر از محل نہ ہوگا کہ طلوعِ اسلام کے متعلق جو اس قدر شور مچایا جا رہا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ سنت ہے۔ تو اس کی تہ میں یہی راز پوشیدہ ہے۔ طلوعِ اسلام نے کہا یہ تھا کہ اگر پاکستان کے آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا تو آئین میں اس کی تصریح نہایت ضروری ہوگی کہ سُنّت کسے کہتے ہیں اور وہ کونسی کتاب میں ملے گی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا آئین لفظی طور پر تو بڑا خوش آیند نظر آئے گا لیکن عملاً وہ ایک دن بھی نہیں چل سکے گا۔ اس لئے کہ جب قانون سازی کا وقت آئے گا اور یہ دیکھنا مقصود ہوگا کہ فلاں بات "کتاب

وسنت کے خلاف ہے یا نہیں۔ تو اس وقت یہ متعین طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ "سنت" سے مراد کیا ہے اور وہ کس کتاب میں ملے گی۔ علماء حضرات جانتے تھے کہ ان کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ اول تو وہ "سنت" کی کوئی متفق علیہ تعریف (Definition) ہی نہیں پیش کر سکتے تھے۔ اور اگر ایسا کر بھی دیتے تو یہ قطعاً ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی ایسی کتاب کا پتہ نشان دے سکتے جس میں وہ "سنت" درج ہو جو سب کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ انھوں نے اپنی اس ضعف کو چھپانے کے لئے (کہ لوگ کیا کہیں گے) شور مچانا شروع کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے۔ (معاذ اللہ) منکرِ شانِ رسالت ہے۔ مقصد سارا یہ تھا کہ اصل سوال اس شور اور ہنگامے میں دب جائے اور ان کا بھرم بنا رہے۔ چنانچہ آپ حیران ہوں گے کہ انھوں نے اس دوران میں "فتنۂ انکارِ حدیث" کے متعلق تو سینکڑوں مقالات اور کتابیں لکھ ڈالیں لیکن اس سوال کا جواب ایک بار بھی نہ دیا کہ سنتِ رسول اللہ پر مشتمل وہ کونسی کتاب ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک واجب التسلیم ہے لیکن یہ حضرات اس سوال کو اپنی ہنگامہ آرائیوں اور عوغا آرائیوں کے شور میں دبا تو سکتے ہیں، اسے ختم نہیں کر سکتے۔ اگر مملکت کے آئین کو "کتاب وسنت" پر مبنی ہونا ہے تو اس سوال کا جواب متعین کرنا پڑے گا کہ سنت کسے کہتے ہیں اور وہ کس کتاب میں ملے گی۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ حکومت کو چاہیئے کہ اس قسم کا سوالنامہ شائع کر کے دیکھ لے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا جواب کیا ملتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ کیا یہ حضرات اسلام کی کوئی مشترک اور متفق علیہ آئیڈیالوجی متعین کر سکنے کے اہل ہیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی اسلامک آئیڈیالوجی متعین بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک واجب التسلیم ہو۔ اس سوال کا جواب "ہاں" میں ہے ---- اور بڑی شدت کے ساتھ "ہاں" میں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس قسم کی آئیڈیالوجی کے متعین کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ پہلے سے متعین شدہ موجود ہے۔

متفق علیہ آئیڈیالوجی صرف قرآن میں ملے گی

سوال یہ ہے کہ وہ ہے کہاں؟ وہ قرآن کے اندر ہے۔ اور قرآن کے متعلق ایک مسلمان بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کے نزدیک واجب التسلیم نہیں۔ آپ اہلِ فقہ کو لیجئے یا اہلِ حدیث کو۔ (انہی کو مقلد یا غیر مقلد کہتے ہیں)۔ دیوبندی کو لیجئے یا بریلوی کو، شیعہ کو لیجئے یا سنی کو۔ ان سب کے نزدیک قرآن، قدرِ مشترک اور واجب التسلیم ہے۔ آپ پوچھ کر دیکھ لیجئے۔ کوئی فرقہ اس سے انکار نہیں کرے گا۔ لہٰذا جب ہمارے پاس ایسی قدرِ مشترک موجود ہے تو پھر ہمیں ان گوشوں کی طرف جانے کی ضرورت کیا ہے جو متنازعہ فیہ ہیں۔

اس مقام پر ان حضرات کی طرف سے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ صاحب! مسلمانوں کا ہر فرقہ قرآن کو مانتا ہے، لیکن اس کے باوجود اتنے فرقے موجود ہیں اگر قرآن وحدت پیدا کر سکتا تو ان میں باہمی اختلاف کیوں ہوتا؟

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں

اس میں شبہ نہیں کہ ان حضرات کی طرف سے چھوڑا ہوا یہ معصوم شوشہ "بڑی حد تک کارگر ہو جاتا ہے لیکن اس سے وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جن کے سامنے قرآن نہیں ہوتا۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) "اگر قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے"۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس نے اپنے نزول کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ.... (۱۶/۶۴) "اس کتاب کو نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے ہیں انہیں نمایاں طور پر واضح کیا جائے۔ اس نے مسلمانوں کو حکم دیدیا کہ وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰) جس بات میں بھی تم میں اختلاف ہو جائے اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب سے کرا لیا کرو۔ اب ظاہر ہے کہ جس کتاب کا اپنے متعلق یہ دعویٰ ہو، اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اختلافات مٹانے کی صلاحیت نہیں رکھتی، دو میں سے ایک بات کو ثابت کر دیتا ہے۔ یعنی

(۱) یا تو یہ کہ اس کتاب کا (معاذ اللہ) دعوےٰ غلط ہے۔ اور

(۲) یا یہ کہ ایسا کہنے والے جھوٹے ہیں۔

پہلی بات کو تو کوئی مسلمان (ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے) کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بات دوسری ہی ہے۔ یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق چلنے کے باوجود اختلافات نہیں مٹ سکتے وہ جھوٹ بولتے ہیں اور قرآن پر بہتان باندھتے ہیں بلکہ اس کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

فرقوں میں اختلاف کیوں ہے؟

اب رہا یہ کہ جب صورتِ حالات یہ ہے تو پھر مختلف فرقوں میں اختلاف کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ ان کے ہاں قرآن کو محض "ثواب" کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ عمل، خارج از قرآن چیزوں کے مطابق کیا جاتا ہے جن میں اختلافات کا ہونا لازمی ہے۔ ان کی عملی حالت تو یہ ہے لیکن بدنام قرآن کو کرتے ہیں۔ یہ ہمارا دعوےٰ ہے (جسے ثابت کرنے کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں) کہ جن امور میں ان کا اختلاف ہے، ان کی سند اور تائید قطعاً قرآن سے نہیں مل سکتی۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ یہ قرآن کے اپنے دعوے کے خلاف ہے۔

لہٰذا وہ اسلامک آئیڈیالوجی، جو بطور قدر مشترک تمام مسلمانوں کے نزدیک نہ صرف قابلِ قبول بلکہ واجب التسلیم ہو سکتی ہے، قرآن اور صرف قرآن سے مل سکے گی۔ مسلمان کو زود یا بدیر، قدامت پرست مذہبی پیشوائیت کے جنگل سے نجات حاصل کر کے، قرآن کی طرف آنا ہو گا۔ اس کے سوا اس کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں۔ یہ وہ حقیقت تھی جو قائدِ اعظمؒ

قائدِ اعظم اور قرآنی آئیڈیالوجی

(مرحوم) کے سامنے اچھی طرح بے نقاب ہو چکی تھی۔ قارئین طلوعِ اسلام

کو یاد ہوگا کہ جب وہ (۱۹؍ اگست ۱۹۴۷ء کو) حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تھے تو وہاں بعض نوجوانوں نے ان سے کچھ سوالات کئے تھے۔ وہ سوالات اور ان کے جوابات (اورینٹ پریس کی وساطت سے) طلوعِ اسلام بابت اپریل۔ مئی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئے تھے ایک سوال یہ تھا کہ۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟ اس کے جواب میں محترم قائدِ اعظمؒ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا تھا

> جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن کریم اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔

اس کے بعد ایک اور سوال کے جواب میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں فرمائی کہ

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت و وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

یہ ہے اسلامک آئیڈیالوجی کا اصل الاصول۔ افسوس ہے کہ محترم قائدِ اعظمؒ کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ورنہ وہ اس اصول کو پاکستان کے آئین کا بنیادی پتھر قرار دیدیتے اور ہماری کشتی (دس برس تک نذرِ گرداب ہونے کے بجائے) اسی دن سے ساحلِ مراد کی طرف پر فشاں چل نکلتی۔ اب بھی کاروانِ ملت کا رخ اُس دن صحیح سمت کی طرف منتقل ہوگا جس دن ہم نے اس اصول کو آئینِ پاکستان کی عمارت کا سنگِ بنیاد قرار دے لیا۔

صدرِ مملکت کی تقریر کی شق اول کا دوسرا جزو یہ ہے کہ اسلامک آئیڈیولوجی کی تشریح و تبیین علم و بصیرت اور عقل

لہ یہ تھے وہ قائدِ اعظم (محمد علی جناحؒ) جن کے متعلق جماعتِ اسلامی کے امیر (مودودی صاحب) ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی سیاست انگریز سے سیکھی ہے اور وہ دین کی الف۔ ب تک سے واقف نہیں۔

ودانش کی روشنی میں عام کی جائے۔ یہ تجویز بھی قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ تو ملت پرستی کے عقیدہ کی رو سے مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس میں ہر کام تقلیداً کیا جاتا ہے۔ یعنی جو کچھ اسلاف سے

قرآن اور عقل

متوارث چلا آرہا ہے اسے بلا دلیل وبرہان ماننا اور اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے چلے جانا۔ اس کے برعکس، قرآن قدم قدم پر تدبر و تفکر کا حکم دیتا ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (۴۷/۲۴) "کیا یہ لوگ قرآن میں فکر و تدبر نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں!" وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو "بدترین مخلوق" قرار دیتا ہے۔ سورۂ انفال میں ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲) "یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے" وہ ایسے لوگوں کو جہنمی قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ؀ (۷/۱۷۹)

"یہ حقیقت ہے کہ ہم نے بہت سے جن وانس، کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (انسان نہیں) حیوانات کی مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ وہ مومنوں کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (۲۵/۷۳) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات پیش کی جائیں تو وہ ان پر (بھی) بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے"

لہذا قرآن کریم کے حقائق و معارف اور اصول و آئین کو عقل و فکر کی رو سے ماننا۔ اور علم و بصیرت کی رو سے ان کی نشر و اشاعت کرنا، تقاضائے خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام اس پر زور دیتا چلا آرہا ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم ۔۔۔ جس کے مطابق مذہبی تعلیم مکتبوں اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے ۔۔۔ ختم کر دیا جائے اور "دین اور دنیا" کی تعلیم سکولوں اور کالجوں میں مشترکہ طور پر دی جائے۔ اس سے ایک طرف، جہالت، علم میں تبدیل ہو جائے گی اور دوسری طرف علم، قرآن کے ساحلوں میں گھر کر سرکش نہیں ہونے پائے گا۔

عصر حاضر کے تقاضوں کا حل

اب ہم صدر مملکت کی تجویز کے تیسرے حصہ کی طرف آتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اسلامک آئیڈیالوجی کی روشنی میں، عصر حاضر کے تقاضوں کا حل تلاش کیا جائے۔ یہ تجویز بھی قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) مستقل اقدار اور اصولی احکام دیئے گئے ہیں۔ ان کی جزئیات مرتب کر کے نہیں دی گئیں۔ ایک ایسے ضابطۂ حیات کو جسے عالمگیر انسانیت کے لئے

ہر زمانے میں راہ نمائی کا کام دینا ہو، ہونا ہی ایسا چاہیئے۔ اس میں ایسے اصولی قوانین ہونے چاہئیں جو غیر متبدل ہوں اور اس کی اجازت ہونی چاہیئے کہ ہر دور کے انسان، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان اصولوں کی روشنی میں اپنے لئے جزئیات آپ مرتب کریں۔ یہ جزئیات، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلتی جائیں گی لیکن اصول اپنی جگہ برائی اور غیر متبدل رہیں گے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو (اپنے خطبات میں) بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے، لیکن اس کی نمود، تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں جما سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے خود قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی دائرے میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ (چھٹا خطبہ)

آئینِ پاکستان

یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کے مطابق طلوع اسلام روزِ اول سے یہ دعوت دیتا چلا آرہا ہے کہ پاکستان کے آئین میں اولین شق یہ ہونی چاہیئے کہ قرآن کے اصول اور احکام غیر متبدل رہیں گے اور ملتِ پاکستانیہ اس کی مجاز ہوگی کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشورہ سے، جزئی قوانین خود مرتب کرے۔ ان (جزئی قوانین) میں، حسبِ ضرورت، تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن قرآن کے اصول اپنی جگہ برائی رہیں گے۔

لیکن ہمارے اربابِ مذہب اس اصول کے سخت مخالف ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو فیصلے، اس سے پہلے ہو چکے ہیں (خواہ وہ کتبِ روایات میں ہوں یا فقہ کی کتابوں میں)، ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

علماء کا جمود

قارئین کو یاد ہوگا کہ سیر کمیٹی کے ایک سوال کے جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ ہماری شریعت میں تمام معاملات کے متعلق فیصلے پہلے سے موجود ہیں جن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ہم سے پوچھے کہ فلاں معاملہ کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم اُسے شریعت کا فیصلہ بتا دیں گے۔

اور حکومت کا فریضہ یہ ہو گا کہ وہ اس فیصلے کو نافذ کرے۔ اس پر جسٹس منیر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب صورت یہ ہے تو پھر ایک اسلامی مملکت میں مجلس قوانین سازی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ضرورت صرف اجرائیہ (EXECUTIVE) کی ہے جو مولوی صاحبان کے بتائے ہوئے فیصلوں کو نافذ کرتی جائے۔

اس طبقہ کے بعض حضرات، جو اپنے آپ کو ذرا لبرل یا ماڈرن ظاہر کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ بعض امور ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کے متعلق شریعت میں پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ ایسے امور کے متعلق حکومت قوانین وضع کر سکتی ہے۔ لیکن جن امور کے متعلق شریعت میں فیصلے موجود ہیں۔ ان کے متعلق ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ ان فیصلوں میں بھی نہیں جو خود قرآن کریم کے فیصلوں کے بھی خلاف ہیں۔ شریعت کے یہ فیصلے، کتب فقہ اور کتب احادیث میں درج ہیں۔ اگرچہ فقہ، فقہاء کے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔ لیکن اہل فقہ کا کہنا یہ ہے کہ فقہا کے اجتہاد کی بنیاد قرآن اور حدیث ہی تھی۔ لہٰذا بات سمٹ سمٹا کر یہاں آ جاتی ہے کہ ہماری کتب احادیث میں جو کچھ درج ہے، اسلامی مملکت قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں

ایک اہم سوال۔ حدیث کی صحیح پوزیشن

اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اس میں تغیر و تبدل کر سکتی ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ آئین پاکستان کی کشتی دس برس تک جس گرداب میں پھنسی رہی اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت (یا مجلس آئین ساز) اس اہم اور بنیادی سوال کے متعلق فیصلہ نہیں کر پاتی تھی ــــ یا تو وہ اس کا فیصلہ کرنے کی اہل ہی نہیں تھی اور یا اس میں فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں تھی ــــ یہ مسئلہ اس لئے زیادہ مشکل اور نازک ہو جاتا ہے کہ احادیث کی نسبت نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے جب لوگوں سے کہا جائے کہ فلاں شخص (یا حکومت) رسول اللہؐ کے فلاں حکم میں تبدیلی کرنے کی بابت کہتا ہے تو وہ اسے سننے تک کے لئے تیار نہیں ہوں گے، چہ جائیکہ وہ نفس معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں۔ عوام کے ان جذبات کو مفاد پرست (مذہبی) گروہوں نے (EXPLOIT) بھی بہت کیا ہے جس کی وجہ سے یہ مسئلہ اور بھی زیادہ نازک اور پیچیدہ بن گیا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ کتنا ہی مشکل اور نازک کیوں نہ ہو، جب تک اس کے متعلق فیصلہ نہیں کیا جائے گا، مملکت پاکستان، آئین سازی اور قانون سازی کے سلسلہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکے گی۔

حدیث کی کتابوں کی پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے کوئی مجموعہ نہ رسول اللہؐ نے مرتب فرما کر امت کو دیا۔ نہ خلفائے راشدینؓ نے مرتب فرمایا۔ نہ یہ صحابہؓ کے زمانہ میں مرتب ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ سوال زیر بحث آیا بھی کہ آیا رسول اللہؐ کی احادیث کو جمع اور مرتب کر لینا چاہیئے۔ قریب ایک ماہ تک یہ سوال صحابہؓ کے زیر غور رہا۔ لیکن آخر الامر فیصلہ یہ کیا گیا کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کی دلیل یہ دی گئی کہ ایسا کرنے سے لوگ کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیں گے

لہٰذا احادیث رسول اللہ کا کوئی مجموعہ اُس زمانے میں مرتب نہ ہوا۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر مجموعہ (کتاب امام بخاریؒ) حضورؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد (کسی تحریری ریکارڈ سے نہیں بلکہ) زبانی روایات کی بنا پر ایک شخص کی ذاتی کوشش سے مرتب ہوا۔ یہ احادیث کے سب سے معتبر مجموعہ کی کیفیت ہے۔ اس سے نچلے درجے کے جو مجموعے ہیں ان کا اندازہ اسی سے لگ سکتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ان مجموعوں میں بے شمار احادیث ایسی ہیں جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ وہ کبھی رسول اللہ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔

احادیث کی قانونی حیثیت

جہاں تک احادیث کی قانونی حیثیت کا تعلق ہے، علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا دیسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انھیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبل نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبہ ششم)

طلوعِ اسلام کا اس باب میں یہی مسلک ہے — یعنی وہی مسلک جو امام اعظمؒ، شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ کا ہے — اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کا دہرانا ناممکن ہے۔ نہ ہی سردست اس میں کسی اضافہ کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے آئین کی ترتیب کا معاملہ ہاتھ میں لینے سے پہلے اس سوال کے متعلق فیصلہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم اربابِ بست وکشاد کے سامنے اس حقیقت کو واضح طور پر رکھ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ

(۱) اگر اس اہم سوال کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا گیا تو آئینِ پاکستان کبھی مرتب نہیں ہو سکے گا۔

(۲) مرحوم آئینِ پاکستان میں اس مسئلہ سے یہ کہہ کر جان چھڑائی گئی تھی کہ پاکستان کے آئین وقوانین "کتاب و سُنّت" پر مبنی ہوں گے۔ اور اس امر کی کہیں وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ اس اصطلاح سے مقصود کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ آئین یکسر ناممکن العمل بن کر رہ گیا۔ اگر مجوزہ آئین میں بھی یہی شکل اختیار کی گئی تو اس کا نتیجہ بھی وہی برآمد ہوگا۔

(۳) اگر یہ فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ کتبِ احادیث (اور فقہ) میں درج ہے وہ بھی قرآنی اصولوں کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہے تو مملکتِ پاکستان موجودہ زمانہ کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکے گی۔ علاوہ ازیں اس سے مختلف مذہبی فرقوں کی گرہیں اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گی۔ اور سب سے بڑی مشکل یہ ہوگی کہ کوئی ایسا قانون بن نہیں سکے گا جو تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ ہو سکے۔ کہہ دیا جائے گا کہ جہاں تک شخصی معاملات (Personal Laws)

کا تعلق ہے، ہر فرقے کے لئے الگ الگ قوانین ہوں گے لیکن ملکی معاملات کے لئے مشترکہ قوانین وضع کئے جائیں گے۔ سو، اوّل تو قرآن کی رُو سے شخصی اور غیر شخصی قانون میں تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے اپنے قوانین میں اس قسم کی کوئی تقسیم نہیں کی۔ یہ اصطلاح انگریز کی وضع کردہ ہے۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی آپ کوئی مشترکہ ملکی قانون ایسا نہیں بنا سکیں گے جو سب کے نزدیک احادیث کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ احادیث کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک یکساں طور پر قابلِ قبول ہو۔

ایک ہی حل ہے

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ اس مسئلہ کا حل اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کہ قرآن کریم کے اصولوں کو غیر متبدل تسلیم کیا جائے اور ان کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل خود تلاش کیا جائے۔ ایسا کرنے میں ہم اپنے اس تمام سرمایہ (حدیث۔ فقہ۔ تاریخ۔ تفسیر۔ وغیرہ) سے مدد لے سکتے ہیں جو اسلاف سے ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن ناقابلِ تغیر و تبدل صرف قرآنی اصول و احکام کو قرار دیا جائے گا۔ یہی خدا کا منشا تھا۔ اسی پر نبی اکرمؐ نے عمل فرمایا اور اسی طریق پر صحابہ کبار گامزن رہے۔ تاریخ میں ایسے نظائر موجود ہیں جن میں خلفائے راشدین (بالخصوص حضرت عمرؓ) نے نبی اکرمؐ کے فیصلوں میں، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق تغیر و تبدل کیا۔ ایک اسلامی مملکت کا یہی طریق ہونا چاہیئے۔

خطاب کی دوسری شق

اپنے خطاب کی دوسری شق میں صدر مملکت نے جو سوال اٹھایا ہے اسے اسلامی نظام کا شرازہ بیں کہنا چاہیئے۔ انھوں نے کہا ہے کہ کوئی آیڈیالوجی کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، اس کی طرف کوئی شخص یکسو ہو کر توجہ نہیں دے سکتا جب تک اسے روٹی کی طرف سے اطمینان نہ ہو۔ دین کے ساتھ روٹی کا تعلق کس قدر گہرا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ملتِ اسلامیہ کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد جو پہلی دعا مانگی اس میں کہا یہ تھا کہ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲/۱۲۶)۔ اے میرے نشو و نما دینے والے! تو اس شہر کو پُر امن بنا دے اور اس کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے، اسے پھلوں کا رزق عطا فرما دے۔ یعنی تعمیر حرم کے بعد ان کے سامنے سب سے اہم سوال امن اور روٹی کا تھا۔

قرآن اور روٹی کا مسئلہ

حقیقت یہ ہے کہ جب تک لوگوں کو امن اور روٹی کی ضمانت (Security) نہ دی جائے، وہ زندگی کے بلند نصب العین کی طرف دل جمعی سے متوجہ نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے امن اور روٹی کو خدا کا انعام قرار دیا ہے اور خوف اور بھوک کو اس کا عذاب۔ سورۃ نحل میں ہے۔ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ۔ اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے جو امن و

اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کا سامانِ زیست ہر جگہ سے بافراغت اس کی طرف چلا آتا تھا فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللهِ۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَأَذَاقَهَا اللهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶/۱۱۲) اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا اس کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے تھے" اس سے ظاہر ہے کہ صحیح روشِ زندگی کا لازمی نتیجہ روٹی کا بافراغت ملنا ہے اور غلط روش کا نتیجہ بھوک کا عذاب ہے۔ دوسری جگہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ

یہاں کا بھوکا۔ قیامت کا اندھا

مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہے وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴) جس کی روزی تنگ ہو جائے وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کی فقط دنیا تباہ ہوئی ہے۔ اسے ہم قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائیں گے۔ اس کی یہ دنیا بھی خراب ہو گی اور عاقبت بھی تباہ و برباد۔ یہ ہے قرآن کی رو سے روٹی کے مسئلہ کی اہمیت۔

ظاہر ہے کہ جب قرآن روٹی کے مسئلہ کو اس قدر اہمیت دیتا ہے تو وہ اس کا اطمینان بخش حل بھی بتاتا ہو گا۔ وہ اس کا حل یقیناً بتاتا ہے اور ایسا حل بتاتا ہے جس تک اس وقت تک دنیا کا کوئی نظام نہیں پہنچ سکا۔ وہ کہتا ہے

روٹی کے مسئلہ کا قرآنی حل

کہ وہ معاشرہ (یا نظام۔ یا مملکت) جو خدا کے قوانین یا مستقل اقدار کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے، اس میں ہر فردِ معاشرہ، اس نظام سے ایک معاہدہ کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے فرد اپنا مال اور جان معاشرہ کے سپرد کر دیتا ہے اور معاشرہ، اس کے بدلے اُسے "جنتی زندگی" کی ضمانت دیتا ہے۔ إِنَّ اللهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱) اس جنتی زندگی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۲۰/۱۱۸) "اس میں نہ بھوک کا خدشہ ہوتا ہے نہ کپڑوں کا۔ نہ پیاس کا خطرہ ہوتا ہے نہ دھوپ کا" یعنی اس میں ہر فرد کو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (خوراک

اسلامی نظام کی ذمہ داری

لباس۔ مکان) میسر ہوں گے۔ کوئی ان سے محروم نہیں رہے گا۔ اسلامی نظام ہر فردِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دے گا اور اعلان کرے گا کہ:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمھارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمھاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس طرح، افرادِ معاشرہ، اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے مطمئن ہو کر، اپنے آپ کو زندگی کے بلند مقاصد

کے لئے وقف کر دیں گے

یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ اسلامی نظام، ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح سے کرے گا؟ اس کے لئے قرآن نے بتادیا کہ جب یہ نظام اُن ذمہ داریوں کو اپنے سرلے گا جن کا وعدہ خدا نے کر رکھا ہے، تو دنیا میں جو چیزیں خدا کی ملکیت ہیں، وہ اس نظام کی تحویل میں چلی جائیں گی۔ ارضِ ربیبی وسائل پیداوار۔ جس میں بنیادی طور پر زمین اور فرعی طور پر دیگر تمام ذرائع پیداوار شامل ہیں، سب اس نظام کی تحویل میں ہوں گے۔ ان کے علاوہ، اس معاہدہ کی رُو سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، افراد معاشرہ اپنی محنت کی کمائی بھی اس نظام کے سپرد کر دیں گے۔ اس سے یہ معاشرہ، ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے گا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و نما کے سامان و ذرائع بھی مہیا کرے گا۔ اسے قرآن کا نظام ربوبیت کہتے ہیں جو خدا کی صفتِ رب العالمینی کا مظہر ہے۔

وسائل پیداوار نظام کی تحویل میں

معاشرتی خرابیوں کا حل

اس نظام کی رُو سے نہ صرف یہ کہ افراد کی روٹی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے بلکہ معاشرے سے وہ تمام خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں جن کا ہم آج بُری طرح سے رونا روتے ہیں اور جن کا کوئی خاطر خواہ علاج ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی بددیانتی۔ رشوت ستانی۔ نفع خوری بلیک مارکٹنگ۔ سمگلنگ۔ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ جب ذرائع پیداوار، نظام کی تحویل میں ہوں گے اور کسی فرد کے پاس اس کی ضروریات سے زائد مال رہ نہیں سکے گا، تو وہ بددیانتی اور غلط روی سے دولت اکٹھی کر کے کرے گا کیا اور اسے رکھے گا کہاں؟ اُس معاشرے میں نہ جائیدادیں بنانے کا سوال ہوگا، نہ دولت جمع کرنے کا خیال۔ افراد اپنے فرائض سرانجام دیں گے اور معاشرہ ان کی ضروریات کا کفیل ہوگا۔ اس میں نہ کسی قسم کا جبر ہوگا نہ اکراہ۔ اس لئے کہ قرآن کی رُو سے مومن کہلائے گا وہی جس نے بلاجبر و اکراہ، بطیبِ خاطر اُس معاہدہ پر دستخط کئے ہوں گے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف مملکت اُس وقت اسلامی کہلائے گی جب وہ اپنے اس عہد کو پورا کرے گی جس کی رُو سے اُس نے افراد کے لئے الجنۃ مہیا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ یہی وہ نظام تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائدِ اعظمؒ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ

علامہ اقبالؒ کا خط

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا مستقبل اس سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی (Social democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

اور اسی نظام کا تصور قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں تھا جب انھوں نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا (اور یہ غالباً ان کی آخری تقریر تھی) کہ۔

قائدِ اعظم کا ارشاد

ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس اہم فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغامِ امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا اور نوعِ انسان کی بہبود، مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

یہ کام فی الواقعہ قرآنی نظامِ ربوبیت سے ہو سکے گا۔ دنیا کے اور کسی نظام سے نہیں ہو سکے گا۔ یہی طلوعِ اسلام کی دعوت ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ اگر یہ دو نکات جنہیں محترم صدرِ مملکت نے اپنے خطاب میں پیش کیا ہے، ہمارے مجوزہ آئین میں اصولی طور پر شامل ہو جائیں، تو وہ آئین کس آسانی سے اسلامی آئین بن سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ

(۱) آئینِ پاکستان کی بنیاد قرآنِ کریم پر ہوگی اور مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو کتاب اللہ کے خلاف ہو۔ اور

(۲) تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔

ہمیں امید ہے کہ محترم صدرِ مملکت اور دیگر اربابِ حل و عقد ہماری ان گذارشات کو اس قابل خیال فرمائیں گے کہ ان پر غور و فکر کیا جائے۔

مجلسِ اقبال

درمعنی ایں کہ بقائے نوع از امومت است وحفظ واحترام امومت اصل اسلام است۔

قرآن کریم نے زندگی کے جن شعبوں میں انقلاب پیدا کیا ان میں عائلی زندگی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں، اگر ان میں سے ایک پہیہ ٹوٹا ہوا یا کمزور ہو تو ایک طرف دوسرے پہیے سے ذرا بھی گاڑی نہیں چل سکتی۔ قرآن نے مصافِ زندگی میں مرد اور عورت کو دوش بدوش کھڑا کر دیا اور صرف اس فرق کو برقرار رکھا جو ان کے وظائفِ زندگی میں فطرت نے قائم کیا ہے۔ یہ فرق تقسیم عمل کا ہے۔ اس تقسیم عمل میں بھی اگر بغور دیکھا جائے تو جو فرائض عورت سرانجام دیتی ہے؛ انسانی معاشرہ میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عورت کے ذمے بچے کی پرورش اور تربیت ہے۔ علمائے نفسیات کی تحقیق یہ ہے کہ ایک بچے کی خصوصیاتِ حیات اور کیریکٹر کی بنیادیں تین برس کی عمر تک استوار ہو جاتی ہیں۔ یعنی جس قسم کی اس کی تربیت آغوشِ مادر یا گہوارے میں ہو گی، وہ بچہ اسی قسم کا انسان بنے گا۔ لہذا یہ کہنا قطعاً مبالغہ آمیز نہیں ہو گا کہ قوم کی تشکیل ماں کی گود میں ہوتی ہے۔ اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ فطرت نے تقسیم عمل کی رو سے جو فریضہ عورت کے سپرد کیا ہے وہ کس قدر اہم ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے حضرت علامہ نے زیر نظر باب میں بیان کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں۔

نغمہ خیز از زخمۂ زن، سازِ مرد
از نیازِ او دوبالا نازِ مرد

یعنی بظاہر ایسا سمجھا جاتا ہے (اور غلط معاشرے میں ہوتا بھی ایسا ہی ہے) کہ عورت کی صلاحیت کی نمود، مرد کی توجہ

اور کوشش سے ہوتی ہے۔ لیکن (علامہ کہتے ہیں کہ) درحقیقت مرد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود عورت کی رہین منت ہے۔ اقبال نے یہ چیز "عام (غلط) تصور کے ازالہ کے لئے کہی ہے ورنہ قرآن کریم مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے "زوج" قرار دیتا ہے جس کے معانی (COMPLIMENTARY) کے ہیں۔ جو دو چیزیں باہم مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ بنیں۔ انھیں "زوج" کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے، عورت کی صلاحیتوں کی تکمیل مرد کے ذریعے ہوتی ہے۔ اور مرد کی صلاحیتوں کی تکمیل عورت کے ذریعے۔

پوششِ عریانیٔ مرداں زن است
حسن دلجو عشق را پیراہن است

یہ ٹھیک ہے کہ مرد کے لئے عورت بمنزلہ لباس کے ہے۔ لیکن زوج کے تصور کی رو سے، قرآن نے ان دونوں کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ جہاں فرمایا ھن لباس لکم وانتم لباس لھن۔ "عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لئے لباس ہو۔" اس لئے (قرآن کی رو سے) اگر حسن، عشق کے لئے پیراہن ہے تو عشق حسن کے لئے وجہ زیست ہے

عشق حق پروردۂ آغوشِ او
ایں نوا از زخمۂ خاموشِ او

حق و صداقت سے عشق کا جذبہ، عورت کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔ جس قسم کی بچے کی تربیت ہوگی اسی قسم کے اسکے خیالات جذبات و عواطف ہوں گے۔ عورت خاموشی ہی خاموشی میں بچے کی اس قسم کی تشکیل کر دیتی ہے جو کسی معلم سے ممکن نہیں۔

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات
ذکرِ او فرمود با طیب و صلوٰۃ

نبی اکرمؐ کی طرف منسوب ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں۔ صلوٰۃ، خوشبو اور عورت۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضورؐ نے عورت کے صحیح مقام کے تعین کے سلسلہ میں امت کو بہترین انداز سے تعلیم دی لیکن ہمارا خیال ہے کہ جن الفاظ میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے وہ حضورؐ کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ حضورؐ نے عورت کے احترام کی تلقین فرمائی ہوگی۔ "پسندیدگی" اور احترام میں جو فرق ہے وہ ارباب بصیرت سے مخفی نہیں۔

مسلمے کو را پرستارے شمرد
بہرہ از حکمتِ قرآں نبرد

جس مسلمان نے عورت کو لونڈی سمجھ لیا اس نے قرآن کی تعلیم سے کچھ حصہ نہیں پایا۔ لیکن اس میں کسی خاص مسلمان (فرد) کا کیا سوال؟ ہماری "شریعت" میں (جو دورِ ملوکیت میں وضع ہوئی) لاتعداد عورتوں کو لونڈیاں بنا کر رکھنے کی اجازت موجود

ہے اور بیوی کا درجہ عورت سے بھی بدتر رکھا گیا ہے۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است　　زانکہ او را با نبوت نسبت است

شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است　　سیرتِ اقوام را صورت گر است

اگر تم صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھو تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ عورت کی ہستی خدا کی طرف سے رحمت ہے اور اسے نبوت سے ایک نسبت ہے۔ (وظیفۂ نبوت، نوع انسان کی اصلاح و تربیت تھا۔ اسی سے انسانیت ایک نئے قالب میں ڈھلتی تھی اور یہی کام اب قرآن کے مطابق عمل کرنے سے ہوتا ہے)۔ یہی فریضہ ماں سر انجام دیتی ہے۔ وہ بھی قوم کی سیرت کو خاص قالب میں ڈھلنے کا موجب بنتی ہے۔

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما

در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

قوم کی تعمیر کی پختگی آغوشِ مادر کی رہین ہے بلکہ یوں کہئے کہ قوم کی تقدیر، ماں کی پیشانی میں جھلکتی ہے۔ جس قسم کی ماں، اسی قسم کی امت۔

ہست اگر فرہنگِ تو معنی رسے

حرفِ امت معنی ہا دارد بسے

عربی زبان میں قوم کے لئے امت کا لفظ آتا ہے اور امت، مشتق ہے لفظ اُم سے جس کے معنی ماں ہیں۔ یعنی امت کی تشکیل اُم (ماں) کے ذریعے ہوتی ہے۔

گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں

زیرِ پائے امہات آمد جناں

نبی اکرم کی طرف منسوب ایک روایت ہے کہ بہشت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے۔ اس سے ماں کا احترام مقصود ہے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" تو یہ قرآن کا حکم نہیں۔ قرآن کی رو سے اطاعت صرف احکامِ خداوندی کی ہو سکتی ہے۔ ماں باپ ہوں یا ان سے بھی بڑھ کر واجب التکریم کوئی اور ہستی۔ اگر ان کا کوئی حکم، خدا کے حکم کے خلاف ہوگا تو اسے قطعاً تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اگر ماں باپ کی اطاعت فرض ہوتی تو حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کے مسلک کے خلاف سرکشی کیوں اختیار کرتے۔

ملت از تکریم ارحام است و بس

ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

قرآن نے عائلی زندگی (FAMILY LIFE) کو خوشگوار اور مستحکم بنانے پر زور دیا ہے۔ یہ (انفرادی زندگی کے

خلاف، اجتماعی زندگی کی طرف پہلا قدم ہے جس کی آخری منزل عالمگیر انسانی برادری ہے۔ اگر عائلی زندگی کا احترام نہ باقی رہے تو مودت و رحمت، اور اخوت و محبت کے جذبات کی پرورش نہیں ہوتی اور عالمگیر انسانی برادری کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔

از امومت گرم رفتار حیات　　　از امومت کشف اسرار حیات
از امومت پیچ و تاب جوئے ما　　　موج و گرداب و حباب جوئے ما

سفرِ حیات میں گرم رفتاری اسی سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے زندگی کے پوشیدہ راز کھلتے ہیں۔ انسانی معاشرہ کے مختلف اسالیب و انداز اور نقوش و حروف اسی ... بنتے اور سنورتے ہیں۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ عورتوں (بلکہ لڑکیوں) کے دو ٹائپ بطور مثال بیان کرتے ہیں۔ ایک ٹائپ اس انداز کا

آن دہِ رستاق زادے جاہلے　　　پست بالائے، سطبرے، بے گلے
ناتراشے پرورش نا دیدۂ　　　کم نگاہے، کم زبانے، سادۂ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں　　　گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں

کسی گنوار کی لڑکی۔ جاہل۔ پست قامت۔ فربہ۔ بدشکل۔ نہ پڑھی لکھی۔ نہ تربیت یافتہ۔ بالکل سادہ۔ فیشن سے ناواقف باحیا۔ کم گو۔ لیکن گود میں بچہ اور بچے کی پرورش کی وجہ سے آنکھوں کے گرد نیلے نیلے حلقے پڑے ہوئے۔ کچھ مفلسی کی وجہ سے۔ کچھ بے آرامی کے باعث۔

ملت ار گیرد ز آغوشش بدست　　　یک مسلمان غیور حق پرست
ہستیِ ما محکم از آلامِ اوست　　　صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست

اگر وہ اپنے بچے کی پرورش اور تربیت اس انداز سے کرتی ہے کہ وہ جب ہو کر بڑا ہو۔ غیور اور حق پرست مسلمان بن جاتا ہے۔ تو یہ لڑکی اور اس کی تمام مشکلات و مصائب، ملت کے استحکام کا موجب، اور اس کی تقدیر کی درخشندگی کا باعث ہیں۔ قوم ایسی لڑکی پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔

اس کے برعکس، دوسرا ٹائپ وہ ہے کہ

وان تہی آغوشِ نازک پیکرے　　　خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکرِ او از تابِ مغرب روشن است　　　ظاہرش زن، باطنِ او نازن است
بندہائے ملتِ بیضا گسیخت　　　تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش　　　از حیا نا آشنا آزادیش

ایک مغربی فیشن کی دلدادہ لڑکی، ہر وقت بناؤ سنگار میں مصروف۔ نمودِ حسن و زیبائش کے جذبے سے بے تاب۔ چال ایسی

کہ ہر قدم پر قیامت نثار ہو۔ جدھر سے گذر جائے فتنے بیدار ہو جائیں۔ بزم دنا زک اور گود سے خالی۔

علم او بارِ امومت بر نتافت
بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کئے ہوئے لیکن تعلیم سے اس نے سیکھا یہی کہ ماں بننا، حماقت کی نشانی اور قدامت پرستی کی دلیل ہے۔

ایں گل از بستانِ ما نا رستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

اس قسم کے پھول ہمارے چمنِ ملت میں نہ ہی کھلے تو اچھا ہے۔ یہ لڑکی نہیں دامن ملت پر داغ ہے جس کا دھل جانا ہی بہتر ہے۔ ایسی بچیاں قوم کے لئے باعثِ فخر نہیں، وجۂ ننگ ہیں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ حضرت علامہ کا مطلب یہ نہیں کہ لڑکیوں کو جاہل، گنوار، تعلیم نایافتہ، کندۂ ناتراش، بے تربیت، بدسلیقہ رہنا چاہیئے۔ اور انھیں تعلیم و تربیت حاصل نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک طرف ایسی لڑکی ہو جو پڑھی لکھی نہیں، علوم مغربیہ سے ناآشنا ہے لیکن طبیعت میں حیا ہے اور بچے کی پرورش اور تربیت کے فکر میں گھلے جاتی ہے تو یہ بچی اُس لڑکی سے کہیں بہتر ہے جو تعلیم و تہذیب میں چاق و چوبند ہے لیکن جوہر نسوانیت سے یکسر عاری۔ لڑکی کا اولین اور بنیادی مقصدِ حیات بہترین ماں بننا ہے۔ اگر علم و تہذیب، اس کے اس مقصد کے حصول میں ممد و معاون بننے کے بجائے، سنگ راہ بنتے ہیں تو ایسے علم سے جہالت بہتر ہے۔ علم، زندگی کو خوشگوار بنانے اور مقاصدِ حیات کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ اگر وہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بننے کے بجائے انسان کو اس کی منزل سے دور لے جانے کا موجب بنتا ہے تو ایسے علم کا نتیجہ کیا ہے؟

اس کے بعد علامہ یہ بتاتے ہیں کہ قوم کی آنے والی نسلیں کس طرح خیابانِ امہات سے نمودار ہوئیں۔ فرماتے ہیں۔

لا الہ گویاں چو انجم بے شمار ۔۔۔ بستہ چشم اندر ظلامِ روزگار
پا نبردہ از عدم بیروں ہنوز ۔۔۔ از سوادِ کیف و کم بیروں ہنوز
مضمر اندر ظلمتِ موجودِ ما ۔۔۔ آں تجلی ہائے ناشہودِ ما
شبنمے بر برگِ گل ننشستہ ۔۔۔ غنچہ ہائے از صبا ناخستہ
بردمد ایں لالہ زارِ ممکنات ۔۔۔ از خیابانِ ریاضِ امہات

ہماری آنے والی نسلیں، جو ابھی کتم عدم میں ناشہود پڑی ہیں۔ جو ستاروں کی طرح لاانتہا ہیں۔ جن کی نمود کا ابھی وقت

نہیں آیا۔ وہ سب اپنے اپنے وقت پر خیابانِ امہات سے گل و لالہ کی طرح نمودار ہوتی چلی جائیں گی۔ انسانیت کا سلسلہ افزائشِ نسل سے وابستہ ہے۔ اس لئے

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزندہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

یاد رکھئے۔ قوم کا حقیقی سرمایہ اس کا مال و دولت نہیں۔ اس کا سرمایہ اس کی آنے والی نسل ہے۔ اس کا مال و دولت اس کے تندرست۔ ذہین۔ محنتی چست و چالاک بچے ہیں۔

حافظِ رمزِ اخوت مادراں
قوتِ قرآن و ملت مادراں

لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ قرآن اور ملت دونوں کی قوت کی صحیح محافظ امت کی مائیں ہیں۔ اور انہی سے افرادِ انسانیہ میں صحیح اخوت کا رشتہ قائم ہے۔

در معنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ اسوۂ کاملہ ایست برائے نساءِ اسلام

احترامِ امہات کے اس تمہیدی اور عمومی بیان کے بعد حضرت علامہؒ سیدۃ النساء، فاطمۃ الزہراؓ کی حیاتِ طیبہ کو اس باب میں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ پہلے اُن کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

مریم از یک نسبتِ عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہراؓ عزیز

حضرت مریم (علیہا السلام) واجب التکریم ہیں، لیکن صرف حضرت عیسیٰؑ کی والدہ محترمہ ہونے کی جہت سے۔ ان کے مقابلہ میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ تین نسبتوں کی جہت سے واجب العزت ہیں۔

نورِ چشمِ رحمۃ اللعالمین — آں امامِ اولین و آخریں
آنکہ جاں در پیکرِ گیتی دمید — روزگارِ تازہ آئیں آفرید

نسبتِ اول یہ کہ آپ حضورؐ رحمۃ اللعالمین کی دخترِ نیک اختر ہیں۔ یعنی اُس رسولؐ کی بیٹی جس نے اپنے پیغامِ حیات بخش سے زمینِ مردہ کو نئی زندگی عطا فرمائی اور انسانی معاشرہ کے لئے ایک نیا نظام دیا۔

بانوے آں تاجدارِ هَلْ اَتٰی — مرتضٰی۔ مشکل کشا۔ شیرِ خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوانِ او — یک حسام و یک زرہ سامانِ او

دوسری نسبت یہ کہ آپ حضرت علیؓ کی رفیقۂ حیات ہیں۔ حضرت علیؓ کے متعلق "تاجدارِ ھل اتیٰ" کہا گیا ہے۔ "ھل اتیٰ" سے سورۂ دہر شروع ہوتی ہے (ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ..... ۷۶/۱) اس میں ایک آیت ہے وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا (۷۶/۸) (ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے لیکن) جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، اہلِ تشیع حضرات کے ہاں ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؓ کی سخاوت کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی۔ علامہ اقبالؒ کا اشارہ غالباً اسی طرف ہے (شاعر کو اپنے خیال کی تائید میں جو کچھ مل جائے وہ اسے استعمال میں لے آتا ہے۔ تاریخی یا دینی تحقیق اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ روایات و حکایات کے متعلق اقبالؒ کی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں) اس سے آگے ہے۔

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

تیسری نسبت یہ ہے کہ آپ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ جیسے فرزندوں کی ماں ہیں۔

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم ۔۔۔ حافظِ جمعیتِ خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں ۔۔۔ پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں

ان میں سے ایک حضرت حسنؓ ہیں جنہوں نے امت کو انتشار سے بچانے اور جنگ کی آگ کو فرو کرنے کی غرض سے سلطنت کو چھوڑ دیا۔

واں دگر مولائے ابرارِ جہاں ۔۔۔ قوتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسینؓ ۔۔۔ اہلِ حق حریت آموز از حسینؓ

دوسرے فرزند حضرت حسینؓ ہیں جن سے حق پرست حریت کا سبق سیکھتے ہیں۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ ان تین نسبتوں کی بنا پر واجب الاحترام ہیں۔ یہ نسبتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن قرآن کی رُو سے عزت و احترام کا معیار انسان کے ذاتی جوہر اور اعمال ہیں نہ کہ اضافی نسبتیں۔ اسی بنا پر ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ بیٹی! نجات کا مدار اعمال پر ہے رسول کی بیٹی ہونا تمہارے کسی کام نہیں آسکیگا لہٰذا حضرت فاطمہؓ کا صحیح احترام ان کی سیرت و کردار کی بنا پر ہے۔ البتہ فرزندانِ حضرت فاطمہؓ کی جہت سے علامہ اقبالؒ نے ایک اور بات پیدا کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حضرت فاطمہؓ کی تربیت کا اثر تھا کہ اس سے ایسے جلیل القدر فرزند پیدا ہوئے۔ اس لئے کہ

سیرتِ فرزندہا از امہات
جوہرِ صدق و صفا از امہات

اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کے متعلق ہے

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

اگر یہ دیکھنا ہو کہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سر جھکا دینے سے کیا حاصل ہوتا ہے تو حضرت فاطمہؓ کی حیاتِ طیبہ کو سامنے لاؤ۔ انہی کی زندگی اسلامی ماؤں کے لئے اسوۂ کامل بن سکتی ہے۔

اس کے بعد اقبال نے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک دن ایک سائل دروازہ پر آیا۔ گھر میں کچھ نہ تھا۔ حضرت فاطمہؓ نے اسے خالی ہاتھ نہ جانے دیا۔ اپنی چادر ایک یہودی کے پاس فروخت کر دی اور اس سے اس سائل کی ضرورت پوری کر دی۔

بہرِ محتاجِ دلش آں گونہ سوخت
با یہودے چادرِ خود را فروخت

اس ایثار و جانسوزی کا اثر یہ تھا کہ

نوری و ہم آتشی فرمانبرش
گم رضائش در رضائے شوہرش

ملائکہ اور ابلیس دونوں حضرت فاطمہؓ کے سامنے جھکے ہوئے تھے۔ ابلیس کے جھکنے کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا تھا۔ (حدیث)۔

دوسرے مصرعہ میں حضرت علامہ نے کہا ہے کہ بیوی کی بلند ترین سیرت یہ ہے کہ اس کی مرضی اپنے خاوند کی مرضی میں گم ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جذباتی طور پر یہ چیز بڑی خوش آئند معلوم ہوتی ہے لیکن قرآن کی یہ تعلیم نہیں کہ بیوی کی اپنی مرضی کچھ نہ ہو۔ وہ ہر بات میں میاں کی مرضی کے تابع چلے۔ میاں اور بیوی دونوں کو قوانینِ خداوندی کے تابع چلنا چاہیئے۔ اور معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرنا چاہیئے۔

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

حضرت فاطمہؓ تمام مصائب و مشکلات کا مقابلہ استقلال و استقامت سے کرتی تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ چکی پیس رہی ہیں اور قرآن کی تلاوت بھی ساتھ ساتھ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز گوہر افشاندے بدامانِ نماز
اشکِ او برچید جبریل از زمیں ہمچو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

اس احساس سے کہ ان سے کہیں احکامِ خداوندی کی تعمیل میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ نماز میں ان کی آنکھیں شبنم فشاں رہتی تھیں۔ اور جبریل امین ان کے آنسوؤں کو چن کر عرش بریں پر چھڑکتے تھے۔

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست　　　پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰؐ است

ورنہ گرد تربتش گردیدمے

سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

اقبال کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی عظمت کے احساس سے میرا جی چاہتا ہے کہ ان کی تربت کے گرد طواف کروں اور پھر اس خاکِ پاک کا سجدہ کروں۔ لیکن خدا کا قانون اور نبی اکرمؐ کا فرمان اس سے مانع ہے۔ اس لئے میں اپنے جذبات کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتا۔

یہی ایک مومن کا صحیح شعار ہے کہ اپنے جذبات کو حدود اللہ سے متجاوز نہ ہونے دے۔

خطاب بہ مخدراتِ اسلام

حضرت فاطمہؓ کے اسوہ کو پیش کرنے کے بعد حضرت علامہ خواتینِ اسلام سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں۔

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما

تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما

اے وہ کہ تیری چادر، ہماری عزت و ناموس کا پردہ ہے اور ہماری زندگی کے فانوس کی چمک تیری روشنی سے ہے۔

طینتِ پاکِ تو ما را رحمت است

قوتِ دین و اساسِ ملت است

تیری پاکیزہ سیرت ہمارے لئے وجۂ رحمت ہے۔ یہی ہمارے دین کی قوت اور ملت کی اساس ہے۔

کودکِ ما چوں لب از شیرِ تو شست

لا الٰہ آموختی او را نخست

ہمارے بچے تیری زبان سے کلمۂ طیبہ سنتے اور توحید کا سبق سیکھتے ہیں۔

می تراشد مہرِ تو اطوارِ ما　　　فکرِ ما۔ گفتارِ ما۔ کردارِ ما

ہماری فکر، گفتار، کردار، سیرت سب اس قالب میں ڈھلتے ہیں جس میں تیری محبت و رافت انھیں ڈھالے۔

برقِ ما کو در سحابت آرمید

بر جبل رخشید و در صحرا تپید

ہماری ملت کی تمام قوتیں جن کا مظاہرہ زندگی کے مختلف گوشوں میں ہوتا ہے، تیری تربیت کی پیدا کردہ ہیں۔

اے امینِ نعمتِ آئینِ حق

در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق

تو آئینِ خداوندی کی نعمت کی امین ہے، تیرے ہر سانس میں دینِ خداوندی کی حرارت پوشیدہ ہے۔

دورِ حاضر تر فروشِ و پُرفن است

کاروانش نقدِ دیں را رہزن است

یہ زمانہ، مکر و فریب سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں ملت کی متاعِ دین و دانش سب لٹ جاتی ہے۔

کورِ یزداں ناشناس ادراکِ اُو | ناکساں زنجیریٔ پیچاکِ اُو

چشمِ او بیباک و ناپرواستے | پنجۂ مژگانِ او گیراستے

اس سے پہلے یہ کہا جاتا تھا (اور حقیقت بھی یہی ہے) کہ بے علم نتواں خدارا شناخت۔ لیکن جو علم دورِ حاضر کی درس گاہوں سے حاصل ہوتا ہے اور جو عقل اس سے پروان چڑھتی ہے وہ بالکل اندھی آنکھ کی طرح ہے۔ وہ خدا کو پہچانتی نہیں۔ لیکن اس میں بے حیائی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کی سیاست کا اصول یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ قوت اور فریب پر اس کا مدار ہے۔ فریب اس انداز کا کہ

صیدِ او آزاد خواند خویش را

کشتۂ او زندہ داند خویش را

جو اس کے دامِ ہوس میں پھنس جاتا ہے وہ اپنے آپ کو گرفتار اور محکوم نہیں سمجھتا۔ آزاد خیال کرتا ہے جو قومیں اس کے پنجۂ اقتدار میں پھنس کر زندگی سے محروم رہ جاتی ہیں وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتی ہیں کہ زندہ ہم ہی ہیں۔ باقی سب مردہ ہیں۔

یہ ہے وہ دور جس سے ہم گذر رہے ہیں۔ ایسے پرفتن حالات میں۔

آب بندِ نخلِ جمعیت توئی

حافظِ سرمایۂ ملت توئی

تجھ پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان نامساعد حالات میں تو ہی ملت کے سرمایہ کی حفاظت کر سکتی ہے تو ہی اس کے شجرِ حیات کی سیرابی کا سامان بہم پہنچا سکتی ہے۔

از سرِ سود و زیاں سودا مزن
گام جز بر جادۂ آبا مزن

تیرے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ دیکھ بھال کر قدم رکھ۔ زمانے کے سود و زیاں کے چکر میں نہ الجھ جا۔ محفوظ طریق یہی ہے کہ جس راستے پر تیرے اسلاف چلتے آرہے ہیں، اسی پر تو چلے جا۔ مغرب کے طور طریقوں کی نقال مت بن۔

ہوشیار از دستبردِ روزگار
گیر فرزندانِ خود را در کنار

زمانہ چاہتا ہے کہ فرزندانِ ملت کو ملت سے چھین کرلے جائے تو ان کی حفاظت میں پوری قوت صرف کردے۔

ایں چمن زاداں کہ پر نکشادہ اند
ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند

یہ چھوٹے چھوٹے بچے، پیدا تو ہوئے صحن چمن میں، لیکن پیدا ہوتے ہی اپنے آشیانے سے گر پڑے اور زمانے کے جھکڑوں نے انھیں دور دراز مقام پر پھینکدیا تو انھیں تلاش کر اور حفاظت سے ملت کے آشیانے میں ان کی پرورش کر۔

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد

تیری فطرت میں قدرت نے بڑے بلند جذبات ودیعت کردیئے ہیں۔ تو حضرت فاطمہؓ کی سیرت پاک کو ہر وقت بطور نمونہ اپنے سامنے رکھ۔ جب تیری سیرت اس قالب میں ڈھل جائے گی تو قوم کے بچوں کی سیرت خود بخود بلند ہوجائے گی۔ اور اس طرح صحن چمن ملت پھر فردوس بداماں ہوجائے گا۔

اس باب پر مثنوی رموزِ بے خودی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا خلاصہ، مطالب، سورۂ اخلاص کی تفسیر کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور آخر میں عرضِ حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین ہے۔ انھیں آئندہ پیش کیا جائے گا۔

اقبال اور قرآن

۲۵۶ صفحات — از:- پرویز — قیمت:- دو روپے

احباب سے ذاتی اپیل

پاکستان کے لئے صحیح اسلامی آئین کا مسئلہ جس قدر اہمیت رکھتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تعلق نہ صرف ہماری اپنی زندگی سے ہے بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کی نجات وسعادت اور فلاح وبہبود بھی اس سے وابستہ ہے۔

گذشتہ آئین کی تدوین کے سلسلہ میں جو کچھ طلوعِ اسلام نے قریب دس سال تک کیا، وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ وہ آئین، قرآن کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ کالعدم قرار پاگیا۔ اب زود یا بدیر، پاکستان کے لئے جدید آئین کی تدوین کا سوال پھر سامنے آنے والا ہے۔ قرائن سے یہی نظر آتا ہے کہ اس مرتبہ جو آئین مدون ہوگا وہ ضرور نافذ العمل ہوگا۔ لہٰذا اس جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

(۲) میری تمام تگ وتاز کا مقصود ومنتہیٰ یہ ہے کہ پاکستان کا آئین قرآنی خطوط پر متشکل ہو اور اس کی رُو سے تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی، مملکت کی ذمہ داری قرار پائے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ آئین کے متعلق قرآنی تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور اس فکر کو پوری فضا میں اس طرح پھیلا دیا جائے کہ ہر ذہن اس کی صداقت کو محسوس کرنے لگ جائے اور ہر آنکھ اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو بے نقاب دیکھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا پروگرام کافی اخراجات چاہتا ہے۔

(۳) آپ احباب کو معلوم ہے کہ ادارۂ طلوعِ اسلام کی آمدنی کا ذریعہ وہ (تھوڑا بہت) منافع ہے جو میری کتابوں کی فروخت سے مل جاتا ہے۔ (میں نے اپنی تمام تصانیف اس مقصد کے لئے وقف کردی ہوئی ہیں) لیکن اس سے بہت تھوڑی آمدنی ہوتی ہے — اتنی تھوڑی کہ اس سے ادارہ کے عام اخراجات بھی بمشکل پورے ہوتے ہیں۔ لہٰذا آئین کے سلسلہ میں مزید نشر واشاعت کے لئے جو اخراجات ضروری ہوں گے ان کے لئے ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔

(۴) ان حالات میں، دو ہی صورتیں ممکن نظر آتی ہیں۔ یا تو آئین کے سلسلے میں خاص کوششوں کا خیال ترک کر دیا جائے۔ یا احباب سے تعاون کی درخواست کی جائے۔ اول الذکر کے لئے دل آمادہ نہیں ہوتا — جی یہی چاہتا ہے کہ اس آخری مرحلہ میں جو کچھ بن پڑے، اسے ضرور کر دیکھنا چاہیئے۔ چہ عجب، ہماری ان کوششوں سے وہ خواب ایک حقیقت بن جائے جسے ہم ۱۹۳۸ء سے دیکھتے چلے آرہے ہیں اور جس کے تصور سے ہماری زندگیاں پُرمقصد بن گئی ہیں —

اس کے برعکس، اگر ہم سفر کے اس آخری مرحلہ میں شکستہ پا ہو کر بیٹھ گئے اور یہاں (خدا نکردہ) غیر قرآنی آئین نافذ ہو گیا تو میں ان احباب سے جو سینے میں دھڑکنے والا دل رکھتے ہیں، پوچھنا چاہتا ہوں کیا انھوں نے اس کا بھی اندازہ کیا ہے کہ اس کے بعد یہ احساس کہ اگر ہم اُس وقت تھوڑی سی ہمت اور کر لیتے تو شاید ہم منزل مقصود تک جا پہنچتے ہمیں کس طرح ساری عمر تڑپاتا رہے گا؛ یہی وہ احساس تھا جو سابقہ کنونشن میں، درد و کرب کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان الفاظ میں بے اختیار میرے لب پر آ گیا تھا کہ

شب ہجراں کے جاگنے والو کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

اندریں حالات میں نے کئی دنوں کی کشمکش اور کئی راتوں کے اضطراب کے بعد، یہی فیصلہ کیا ہے کہ اس باب میں احباب سے تعاون کی درخواست کروں — اس لئے بھی کہ یہ معاملہ میرا ذاتی معاملہ نہیں۔ یہ ان تمام دوستوں کا مشترکہ معاملہ ہے جو اس مقصد میں مجھ سے ہم آہنگ ہیں۔

(۵) لہٰذا میں اپنے ان تمام احباب سے، جو طلوع اسلام کے قرآنی مشن سے متفق ہیں اور مجھ پر اعتماد کرتے ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ، وقت کی نزاکت اور مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر، مجھ سے تعاون کریں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اگر ایک ہزار روپے ماہوار کی آمدنی کا انتظام ہو جائے تو اس سے آئین کے سلسلہ میں نشر و اشاعت کا جو پروگرام میرے زیر نظر ہے، عمل میں لایا جا سکے گا۔ اس کے لئے اگر پچیس پچیس روپے ماہوار دینے والے چالیس احباب بھی آمادہ ہو جائیں تو یہ مرحلہ طے ہو سکتا ہے۔ لیکن ان احباب کے لئے یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رکھنا ہو گا جب تک آئین سازی کا مسئلہ اپنی آخری منزل تک نہ پہنچ جائے — نظر بظاہر اس میں ایک دو سال کا عرصہ تو ضرور لگ جائے گا۔

(۶) میرے جو احباب اس کے لئے آمادہ ہوں، وہ براہ کرم اگست کے پہلے ہفتہ میں مجھے مطلع فرمائیں۔ میں اس پروگرام کے متعلق ان کا جواب آنے کے بعد فیصلہ کر سکوں گا۔

والسلام

پرویز

۲۱ر جولائی ۱۹۵۹ء

تفسیر المنار

(سورۃ بقرہ)

(مسلسل)

(علامہ مفتی محمد عبدہٗ مرحوم)

ایمان بالغیب

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ایمان اس پختہ یقین و تصدیق کو کہتے ہیں جس میں انسان کا نفس پوری طرح اس عقیدہ کا مقر و معترف ہو جس پر وہ ایمان رکھتا ہو، پوری طرح اسے قبول کرتا ہو اور اس کے سامنے اپنی پوری قوتوں کو جھکا دے کسی شخص کے ایمان کو پرکھنے کے لئے اس کا عمل محبت و معیار ہے (یعنی اگر عمل سے وہ اپنے ایمان کے تقاضے پورے کر رہا ہے تو اس کا ایمان کامل ہے ورنہ اسی اعتبار سے ناقص و کمزور)

اَلْغَیْب سے مراد وہ تمام امور و حقائق ہیں جن تک علم انسانی کی دسترس نہ ہو سکی ہو۔ مثلاً ذات باری تعالیٰ ملائکہ دار آخرت وغیرہ[1]۔

دنیا میں دو قسم کے خیالات رکھنے والے انسان پائے جاتے ہیں: ایک تو مادہ پرست جو محسوس چیزوں کے علاوہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے۔ دوسرے وہ لوگ جو مادی اشیاء کے علاوہ غیر مادی چیزوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی ایسی چیزوں پر جو

---

[1] بیشک یہ باتیں عالم ناشہود سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مقام پر ایمان بالغیب سے مراد یہ ہے کہ جس نظام کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے اس کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھا جائے۔ اس یقین کے بغیر انسان اس نظام کو عملاً متشکل کر نہیں سکتا۔ (طلوع اسلام)

ہمارے شعور واحساسات سے ماوراء ہیں۔ اور جن کی طرف دلیل یا وجدانِ سلیم کے ذریعہ رہنمائی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ پر ایمان، اس کے فرشتوں پر ایمان ـــــ وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کا نظر نہ آنے والا لشکر ہے۔ جس کی مابہ الامتیاز خصوصیات وخواص اللہ ہی جانتا ہے۔ نیز روزِ آخرت پر ایمان، ایمان بالغیب ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان نہیں لائے گا۔ اس کے لئے قرآن سے رہنمائی ممکن نہیں ہے۔ جسے اپنی ہدایت کی فکر ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقل ودلائل سے کام لے کر اس عالمِ موجودات کے ایسے "الٰہ" کا ثبوت مہیا کرے جو اُن صفاتِ کمال سے متصف ہو جن کے بغیر الوہیت کی تکمیل ناممکن ہو، پھر وہ اپنے آپ کو مطمئن کرلے کہ یہ قرآن اس ذاتِ الوہیت مآب کی طرف سے ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن سے ہدایت پانے والے متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا "اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" یاد رکھئے۔ "ایمانِ بالغیب" سے مراد یہ عقیدہ ہے کہ ماورائے محسوسات بھی موجودات ہیں۔

ایسا اعتقاد رکھنے والا (یعنی ایمان بالغیب کا قائل) صحیح اور سیدھے راستے کے سرے پر کھڑا ہے۔ اسے اب صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے راستہ پر چلادے اور آخر تک پہنچادے۔ کیونکہ جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ماورائے محسوسات ایسے موجودات ہیں جن کی عقل سے تائید وتصدیق ہوتی ہے خواہ وہ حسی طور پر مشہود نہ ہوں تو اس کے سامنے جب بھی ذاتِ باری تعالیٰ کا ثبوت دیا جائے گا جو فاطر السمٰوٰت والارض، مادہ اور اس کے لواحقات پر قابض ومتصرف اور ان صفات سے متصف ہے جن کا بیان اس نے خود اپنے رسولوں کی زبانی فرمادیا ہے۔ تو اسے ان امور کی تصدیق گراں نہ گزرے گی۔

اسی طرح جب رسول کی زبان سے وہ روزِ آخرت کا وصف سنے گا۔ یا اللہ کے علم سے مخصوص عالموں میں سے کسی عالم کا تذکرہ سنے گا مثلاً عالمِ ملائکہ، تو نبوت کا ثبوت فراہم ہوجانے کے بعد اسے ان غیبی امور کی تصدیق میں کوئی تردد نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن سے ہدایت پانے والے متقین کے تمام اوصاف میں سب سے پہلے اس کو بیان فرمایا۔

لیکن جو محسوسات کے علاوہ کسی وجود کا قائل ہی نہ ہو اور یہ خیال کرتا ہو کہ صرف محسوسات ہی سب کچھ ہے تو اس کی طبیعت ماوراء مشہودات قسم کی چیزوں کے ذکر سے نفرت وگریز کرتی ہے۔ اور ایسے شخص کے دل میں ان چیزوں کی حقیقت ثابت کرنے کے لئے بہت مشکل سے راہ نکالی جاسکتی ہے ممکن ہے کہ طویل مدت، سخت محنت اور دور دراز کی مختلف عقلی دلائل کے ذریعہ اس کے مطالبہ کو پورا کیا جاسکے۔ لیکن کون ہے جو اس قدر صبر آزما مراحل سے گذرنے کی تاب لاسکے۔ لہٰذا اس قسم کے آدمی کے سامنے جب قرآن پیش کیا جائے گا تو اس کی طبیعت پر تعلیماتِ قرآنی شاق گزرے گی اور وہ بخوشی اسے سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوگا۔ پھر ایسا شخص قرآن سے ہدایت کیونکر پائے گا۔ اور اپنی گمراہیوں سے اسکے ذریعہ کیسے نجات حاصل کرسکے گا؟

لیکن عام طور پر ایمان بالغیب سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ اندھوں کی طرح تقلیدی طور پر کچھ باتوں کو مان لیا جائے جن کا زبان سے نکلنے کے بعد نہ دل پر کوئی اثر ہو، نہ اعمال و افعال سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ یہ ایمان عقل کی نگاہوں سے دیکھنے کا نتیجہ نہیں ہوتا نہ اسے قلبی وجدان کی تائید حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ اوہام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی کیفیت جس کا نام ایمان رکھ لیا جاتا ہے۔ قطعاً دل کو قرآن کی طرف رہنمائی کرنے میں مفید معاون نہیں ہوسکتی۔ چونکہ ایمان کے بارے میں یہ غلطیاں رونما ہونے کا امکان تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایمان کا صحیح مفہوم بتانے کے لئے ان مومنین بالغیب کی کچھ علامتیں بھی اسی جگہ بیان فرما دیں جو قرآن مجید کی تعلیمات سے ہدایت حاصل کر سکیں گے چنانچہ فرمایا کہ ایمان بالغیب رکھنے والوں کی پہلی علامت یہ ہے کہ وہ صلوٰۃ کی اقامت کرتے ہیں۔

اقامت صلوٰۃ

" وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ " صلوٰۃ کے معنی ہیں قول یا عمل یا ان ہر دو کے ذریعہ معبود کے سامنے ضرورت و احتیاج کا اظہار کرنا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ " صلوٰۃ کے معنی " دعا ہیں اس لئے کہ ایک کریم و برتر ذات کے مجرد تصور سے مراد ہی یہ ہے کہ اس سے ضرورت مانگی جائے اور اس کی نعمتوں سے سرفرازی حاصل کی جائے۔ یا اس کی سزا سے بچاؤ کی شکل پیدا کی جائے[1]۔ ذرا غور کیجئے ان لوگوں کے حال پر جو سر جھکائے نہایت ادب و احترام سے حکام اور افسروں[2] کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس جذبہ کو طاری کرتے میں یہی دو جذبے کار فرما نہیں ہوتے۔ یا تو انھیں ان کی سزا کا خوف ہوتا ہے اور وہ اس سے بچاؤ کے خواستگار ہوتے ہیں یا پھر وہ ان سے کسی نعمت و احسان کے متمنی ہوتے ہیں، اس میں اضافہ چاہتے ہیں یا اس کی بحالی و برقراری کے خواہاں ہوتے ہیں؟

صلوٰۃ کا یہ تصور زمانۂ جاہلیت میں بھی بعض لوگوں میں پایا جاتا تھا جنھیں حَنِيفِيِّين یا حُنَفَاءَ کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ نیز بعض اہل کتاب میں بھی یہ تصور موجود تھا۔

مذکورہ بالا معانی کے لحاظ سے صلوٰۃ کی اکمل و افضل شکل اسلام نے پیش کی ہے۔ اور یہی وہ صلوٰۃ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔ یہ اقوال و افعال جو سنت متواترہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ اس صحیح اور کامل شکل[3] کے آئینہ دار ہیں جو ہمیں ایک معبود حقیقی کی ضرورت کا پورا پورا احساس دلاکے، ہمارے نفوس میں اس کی

---

[1] یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق مانگا جاتا ہے اور اسی کے مطابق مل سکتا ہے۔ یعنی یہ انسان کے ان اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق سرزد ہوں۔ اور جن کی خلاف ورزی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ اسی کو سزا کہا جاتا ہے۔

[2] خدا کے لئے افسر کی مثال صحیح نہیں۔ ہم افسر کے سامنے اس لئے جھکتے ہیں کہ اس کے جذبات کو متاثر کرکے اسے اپنا طرفدار بنایا جائے۔ خدا جذبات سے بلند ہے۔ (طلوع اسلام)

[3] ہمارے موجودہ زمانے میں اس کی مختلف شکلیں ہیں حالانکہ رسول اللہ نے ایک ہی شکل متعین فرمائی ہوگی۔ ان تمام شکلوں کے لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ یہ سب سنت متواترہ سے ثابت ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ہر فرقہ اس کا مدعی ہے (طلوع اسلام)

عظمت بٹھاتے ہیں اور ہمارے دلوں کو بار بار خدا کے اٹل قوانین کی یاد دلاتے رہتے ہیں بشرطیکہ صلوٰۃ ادا کرنے والا اس کی صحیح شرائط کے مطابق اقامت صلوٰۃ کا فرض ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یُصَلُّوْنَ نہیں فرمایا بلکہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ فرما کر ان دونوں شکلوں کا فرق بھی ظاہر کر دیا، اس لئے کہ جب صلوٰۃ اپنی مخصوص کیفیت میں محدود ہو تو اس معینہ کیفیت کو ادا کرنے والے کے لئے "مُصَلِّیْ" کہا جائے گا۔ خواہ اس کا یہ عمل صلوٰۃ کے اس مفہوم و مقصود اور روحِ صلوٰۃ سے بالکل خالی ہی کیوں نہ ہو جو درحقیقت صلوٰۃ کی ان ظاہری حرکات و سکنات سے مطلوب ہے۔ یہی سبب ہے کہ صلوٰۃ کے لئے ایک ایسے لفظ کی ضرورت پڑی جو اس معنی کو بھی ظاہر کرے جس سے روحِ صلوٰۃ کے قیام پر روشنی پڑتی ہو، اور اسی کیفیت کو قرآن مجید نے لفظ "یُقِیْمُوْنَ" سے بیان فرمایا ہے۔ مفسرین نے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے "پورے حقوق ادا کرتے ہوئے کامل طہارت کے ساتھ تمام ارکان و سنن بجالاتے ہوئے صلوٰۃ ادا کرنا" لیکن یہ تو محض صلوٰۃ کی ظاہری شکل و صورت کی تعریف ہے، حقیقت میں صلوٰۃ کی وہ روح جس پر اس کا دارومدار ہے اور جسے لفظ "یُقِیْمُوْنَ" بتا رہا ہے۔ وہ ہے اللہ کی طرف توجہ، اس کے قانون پر عمل درآمد، اور اپنی تمام قوتوں کو اس کے سامنے جھکا دینا، اور دل کی گہرائیوں سے خدائے تعالیٰ کی ضرورت کا احساس کرنا اور اس کے سامنے اپنے فقر کا اظہار کرتے رہنا۔

پس اگر نماز کی ظاہری شکل و صورت اس حقیقت تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہو تو صلوٰۃ ادا کرنے والے کے لئے قطعاً یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے "اقامتِ صلوٰۃ" کیا، ایسے شخص نے تو نماز کا ستون ختم کر دینے کی وجہ سے بجائے اقامتِ صلوٰۃ کے صلوٰۃ کو منہدم کرنے کا عمل انجام دیا ہے۔ یہ شخص تو روحِ صلوٰۃ سلب کر کے صلوٰۃ کو قتل کرنے کا مرتکب ہوا ہے۔

انفاق

ایمان بالغیب رکھنے والوں کی دوسری علامت یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس کا انفاق کرتے ہیں۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ لغت میں رزق سے مراد روزی، دین، حصہ، عطیہ اور بخشش ہے۔ خواہ وہ رزق حسی ہو یا معنوی۔ مال و اولاد ہو یا علم و تقویٰ، سیاق و سباق اور قرائن کی بناء پر رزق صرف روزی اور امورِ معاش کے لئے بھی خاص ہو جاتا ہے۔ علماء اہل سنت کا خیال ہے کہ ہر چیز جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور نفع حاصل ہو وہ رزق کہلائی جاسکتی ہے۔ خواہ وہ حلال ہو یا حرام۔ لیکن معتزلہ اس میں حلال ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔

• نَفَقَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کا کم ہو کر ختم ہو جانا۔ فنا ہو جانا اور باقی نہ رہنا۔ اور اَنْفَقَہٗ کے معنی ہیں کسی چیز کو خرچ کر کے ختم کر دینا اور اپنے ہاتھ سے نکال دینا۔ راہِ خدا میں انفاق صحیح ایمان کی واضح ترین علامت ہے۔ یہ صفت ایمان بالغیب کی پختہ ترین دلیل ہے۔ اس لئے کہ نماز روزہ کی قسم کی بدنی عبادات تو بیشتر لوگ ادا

کرتے رہتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے کوئی ایسی شکل آتی ہے۔ جہاں راہِ خدا میں انفاق کا مسئلہ سامنے آئے تو وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور ان کے دل بطیب خاطر مال خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یہاں انفاق سے مراد وہ اخراجات نہیں ہیں جو انسان اپنے اہل و عیال پر کرتا رہتا ہے۔ نہ اس سے مراد وہ جذبہ ہے جسے جود و کرم کہا جاتا ہے۔ اور جس کے تحت مہمان نوازی وغیرہ شہرت و جاہ طلبی کے لئے کی جاتی ہے۔ نہ وہ اخراجات جو دوستی اور محبت کو بڑھانے اور پختہ کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں، کیونکہ یہ چیزیں "ایمان بالغیب" کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں صرف وہ انفاق شامل ہوگا۔ جو اس شعور و احساس کے مدنظر کیا جائے کہ یہ تمام مال و دولت اور انعامات مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے ہیں، اور جس طرح میں اللہ کا بندہ ہوں دنیا کے تمام محروم و مسکین لوگ بھی اللہ ہی کے بندے ہیں۔ یہ خدا کے مساکین و فقراء بندے کسی کمزوری یا رزق تک پہنچانے والے اسباب کی محرومی کے باعث روزی اور آسودہ زندگی گذارنے سے محروم رہ گئے ہیں۔ یا پھر اس انفاق کے تحت وہ انفاق آئے گا جو اس احساس کے تحت ہو کہ مسلمانوں کی مصلحتوں اور ان کی منفعتوں کے لئے انفاق مال لابدی ہے اور بغیر مال خرچ کئے ہوئے مسلمانوں کے معاشرہ میں سدھار اور اصلاح پیدا کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مالداروں کے لئے راہ خدا میں مال کا انفاق فرض قرار دیا ہے۔ تو راہِ خدا کے تمام اخراجات میں یہ بہترین مصرف ہے۔ اب جو شخص کہ ان جذبات و احساسات کی بنا پر اپنے دل میں اپنی محبوب ترین شے۔ یعنی اپنا مال۔ راہ خدا میں خرچ کرنے کی تڑپ رکھتا ہے تاکہ قوانین خداوندی کے مطابق حاجتمندوں کی ضرورت پوری کر کے معاشرہ کو متوازن کرے تو بلا ریب وہ ایمان بالغیب کی اس بلندی پر کھڑا ہوا ہے جہاں وہ قرآنی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنے کی پوری پوری صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے اور جونہی وہ قرآن کی آواز سنے گا اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گا۔

(راز ص ۱۲۷ تا ص ۱۳۰)

ایمان اور نفاق میں مابہ الامتیاز فرق

ایمان والوں کی صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف منافقین جو کچھ منہ سے کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے اس فرق سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید ایمان کسے کہتا ہے۔ وہ اس شخص کے ایمان کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا جو قرآن مجید پڑھ کر اس پر اپنا محاسبہ نہیں کرتا۔ اور اسے اپنے اور دوسروں کے اعمال و اقوال کے لئے کسوٹی نہیں بنا لیتا۔ یا جو قرآن کو ایسا تاریخی قصہ سمجھ کر پڑھتا ہے جس کے کردار مر چکے ہوں اور وہ خود کو اس میں بتائے ہوئے قاعدوں سے مستغنی خیال کرتا ہو۔

یاد رکھئے اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش کرنے والے وہی نہیں تھے جو ان آیات کا سبب نزول بنے تھے۔ اس لئے کہ قرآن کی آیات و تعلیمات اس عہد پر ختم نہیں ہوئیں۔ قرآن مجید زندہ کتاب ہے۔ جو کبھی نہیں مرے گا وہ ہمیشہ اپنے فیصلے بیان کرتا رہے گا اور ہر زمانہ میں اپنی قوت و طاقت کا اعلان کرتا رہے گا۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو اللہ اور روزِ آخرت

پر ایمان کا دعوےٰ کرے اور باایں ہمہ اتباعِ شہوات میں لگا رہے اور اس کا ایمان اسے ناروا حرکات سے باز نہ رکھے تو اس کا دعویٰ ایمان محض وہم و خیال ہے جو صرف زبانی جمع خرچ ہے اور اگر وہ اپنے اس طرح کے عقیدے پر بھروسہ کرکے مطمئن ہے تو وہ خود کو فریب دے رہا ہے، اپنے رب کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہا ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ علام الغیوب دلوں کی باتوں سے بے خبر ہے۔

دلوں کی بیماری

"فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" عربوں میں عام طور پر عقول کے لئے قلوب بولا جاتا ہے اور مرض سے وہ کمزوری مراد ہے جو عقول کو لاحق ہو جائے تو ان کو غور و فکر اور معاملات و حقائق کی تہ تک پہونچنے کے قابل نہ چھوڑے۔ شک اور وہم بھی اس بیماری کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ یہ بیماری ایسی تاریکی ہے جو عقل کی راہ میں اس طرح حائل ہو جائے کہ نورِ عقل اس کو پھاڑ کر آگے نہ جا سکے۔ اور اس طرح عقل احکامات الٰہی کے اسرار و حکم معلوم کرنے سے رک جائے۔ اس کے برعکس وہ نورِ عقل جو اس تاریکی کے آر پار ہو کر ان احکامات کے اسرار و غوامض تک پہونچ جائے اور نفس کو ان احکام و تکالیف کی ظاہر و باطن مصلحتوں پر مطمئن کر دے "تفقہ فی الدین" کہلائیگا۔ قرآن مجید نے اس قسم کی صلاحیتوں کے نقدان کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے "لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (۷:۱۷۹)"۔ یعنی ان کے پاس عقلیں ہیں لیکن وہ ان سے جہالت کی تاریکیوں کو چھانٹنے کی کوشش نہیں کرتے۔

عقول کے لئے "قلوب" کا لفظ اس لئے بھی استعمال ہوا ہے کہ دل ہی وہ جگہ ہے جس میں وجدانی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ جو اعمال پر برانگیختہ کرتی ہے۔ اس کا نمایاں احساس تم دل کی ان دھڑکنوں سے کر سکتے ہو جو خوف و مسرت کی شدت میں بڑھ جاتی ہیں۔ عقل ایسے اعتقاد کو جسے وہ روایاتی اور تقلیدی طور پر مانتی ہے دماغ کے کسی گوشہ میں رکھ لیتی ہے اور اس کا دل پر کوئی زور نہیں ہوتا۔ نہ ایسے عقیدے وجدان پر کوئی اثر ڈالتے ہیں۔ اور ایسا اعتقاد جسے دل کی تائید اور وجدانی قوت[1] حاصل نہ ہو اللہ تعالیٰ کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اور نہ انسان کی زندگی میں ایسا اعتقاد کوئی مفید نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ حقیقی ایمان وہی ہے جو انسان کو مختلف اعمال پر ابھارے۔ ایسا ایمان جو قوتِ برہان سے دل پر ضربات[1] لگائے اور وجدانی حلاوت سے محروم نہ ہو بے فائدہ ایمان ہے۔

ضعفِ عقل کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ بعض تو فطری اور پیدائشی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ پاگلوں اور بیوقوفوں کا حال ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو نہ کسی کام کرنے کی تکلیف دی جا سکتی ہے۔ نہ کسی عمل پر ملامت کی جا سکتی ہے

---

[1] وجدانی قوت یا کیفیت سے مراد دل کی وہ قوت ہے جو انسانی اعمال کی محرک بنتی ہے۔ اس سے باطنی قسم کی واردات مفہوم نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

بعض اوقات ضعفِ عقل کا سبب تربیتِ عقلی کا فساد ہوتا ہے۔ جیسا کہ ان مقلدین کا حال ہے جو اپنی عقلوں سے کام نہیں لیتے اور انہی اوہام و خیالات پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ جو ان کی قوم میں عام طور پر مروج ہوتے ہیں۔ وہ انہی بدعملیوں۔ بخِتہ عادتوں، اور تقلیدی مراسم کو اپنا لیتے ہیں۔ جن کے باعث ان کی قوم کے دلوں کو زنگ لگ چکا ہوتا ہے۔ اور قطعاً اس طرف توجہ نہیں دیتے کہ ان اوہام و خرافات کے پردوں کو چاک کر دیں اور ان حجابات کو زائل کر کے حکمِ خداوندی کے بموجب علم و عرفان اور قرآن کی مضبوط رسی کو تھام لیں۔ ایسے لوگوں کے پاس ہر زمانہ میں بس ایک ہی جواب ہوتا ہے جسے قرآن مجید نے نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ " اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ: ہم نے اپنے آباد اجداد کو ایک خاص طریقہ پر کاربند پایا تھا۔ اور ہم بھی انہی کی اتباع کرتے رہیں گے ؛ (۲۳/۴۳) تا آنکہ وہ دن آجائے گا جب انکی نگاہوں پر حقیقت منکشف ہو جائے گی اور وہ کہیں گے۔ " رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔ اے ہمارے پروردگار! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہمیں سیدھی راہ سے بھٹکا دیا؛ (صفحہ ۱۵۳ و ۱۵۴)

تمثیل

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝

(ترجمہ) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، جب اس آگ سے اس کے ماحول کی چیزیں روشن ہوگئیں تو اللہ ان کی روشنی کو لے گیا اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا جہاں انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔ سو وہ رجوع نہیں کرتے۔

ان آیات میں ان لوگوں کی مثال پیش کی گئی ہے جن کی ہدایت کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے وہ تمام ذرائع ختم کر دیئے اور ان تمام دروازوں پر تالے ڈال دیئے جن سے قابل اعتماد رہنمائی ممکن تھی۔ یہ لوگ اپنی مروجہ رسوم کی مخالفت میں نہ عقل پر بھروسہ کرتے ہیں نہ ہوش و حواس سے کام لیتے ہیں نہ وجدان کی سنتے ہیں۔

دونوں آیات کا بغور مطالعہ اس امر کی صحیح ترجمانی کر دے گا کہ " ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کا کیا مفہوم ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ اللہ انھیں کفر پر مجبور کر دینا چاہتا ہے یا وہ ان سے ایمان پر قائم رہنے کی صلاحیت سلب کر لینا چاہتا ہے بلکہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ اپنے اسی قانون (سنت اللہ) کو بیان کر رہا ہے کہ جو لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے خدا کا قانون ہے کہ ان کی وہ صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

اس مثال میں بتایا گیا ہے کہ جو منزل من اللہ کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو گویا اس کے لئے ایک شکل ایسی روشنی کی پیدا ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ شبہات کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کر کے کٹھن راہ کی مشکلات پر قابو پاسکتا ہے۔ اس کے سامنے وہ تمام باطل خیالات، لغو خواہشات اور لایعنی جذبات نمایاں ہو جاتے ہیں، جو اسے راہِ حق سے

روکے رہتے ہیں۔ لیکن جونہی اس نور سے اس پر یہ چیزیں اپنی حقیقی شکل میں واضح ہوتی ہیں وہ اپنے لغو اور باطل خیالات سے نفرت کرنے کی بجائے الٹا اس نور سے متنفر ہوجاتا ہے اور فوراً ہی اس کی خبیث تقلیدی تاریکی اس پر مسلط ہوجاتی ہے، اور شیطان اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ اس طرح نور اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور وہ صحیح حواس کی قوتوں سے محروم ہوکر گوناگوں گمراہیوں اور تاریکیوں میں غوطے مارنے لگتا ہے۔

ان لوگوں کو راہِ حق سے باز رکھنے والی ایک ہی تاریکی نہیں ہوتی، قسم قسم کے عقائد، رسومات و خیالات، خواہشات و جذبات اور شخصیات ان کی راہ میں حق سے روک بن جاتے ہیں۔ اور اسی چیز کو قرآن مجید نے "ظُلُمٰت" تاریکیوں کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ جو جمع ہے۔

"تَرَکَهُمْ" کا لفظ بتارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے قانون کے مطابق اُس وقت اپنی عنایات ختم کیں جب وہ خود مرہوکر اس قانون سے پھر گئے۔ اس نے انہیں اس وقت چھوڑا جب انھوں نے اس کی ہدایت کو چھوڑ دیا۔

نورِ ایمانی سے بہرہ در ہونے کے لئے یہی نہیں کہ انھوں نے اپنی بصیرتوں کے چراغ گل کردیئے بلکہ دوسرے تمام ایسے راستے بھی بند کرلئے جن سے نفس کو ہدایت کا علم ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "لَا یُبْصِرُوْنَ" ہی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اس کے آگے "صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ" بھی فرمادیا۔ غور فرمایا آپ نے کہ دلائل و براہین منقولہ کے سامنے کیوں کارگر نہیں ہوتے؟ ایسے لوگ نہ اپنے اندرونی بگاڑ سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ احوالِ امم کا ان پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ یہ اپنی ضلالت سے کسی قسم کا انحراف پسند نہیں کرتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تاریکیوں سے نکل نہیں سکتے۔

جیسے تاریک رات میں لق و دق صحرا میں کوئی ایسا شخص گھر گیا ہو جو نہ کسی راستہ بتلانے والے کی آواز سن سکتا ہے اور نہ اپنی مدد کے لئے کسی کو پکار سکتا ہے، نہ ہی کسی روشنی سے ہدایت کا اشارہ پاسکتا ہے۔ ایسا شخص ضرور ان تباہیوں کا شکار ہوکر رہے گا (وما للظالمین من انصار)

دوسری تمثیل

اَوْ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْکٰفِرِیْنَ ○ یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

یا آسمان سے اترنے والی بارش کی طرح، جس میں اندھیریاں، گرج اور بجلی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس کی بجلی کے کڑکوں سے موت کا اندیشہ محسوس کرتے ہوئے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تو کافروں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجلی ان کی نگاہوں کو اچک لے گی۔ جب بھی بجلی ان کے لئے روشنی

کرتی ہے وہ اس میں چلتے ہیں اور جب وہ نقاب اوڑھ کر تاریکی پھیلا دیتی ہے تو یہ لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور
اگر اللہ چاہتا تو وہ ان کے کانوں اور آنکھوں کو لے جاتا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے[1]

ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین کے یہ لکھ دینے سے کسی کو دھوکہ نہیں لگنا چاہیئے کہ یہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے منافقین کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ قرآن مجید روزِ قیامت تک کے لئے مرشد و ہادی ہے اور اس کے مطالب و معانی عمومی حیثیت رکھتے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانہ کے حالات پر مشتمل ہیں۔ اس نے کہیں بھی ایسا اسلوب اختیار نہیں کیا جس سے اس کی انذار و تبشیر چند خاص انسانوں میں محدود ہو کر رہ جائے۔ وہ تو ہمیشہ ایسے اخلاق و عادات اور اعمال و عقائد کا تذکرہ کرتا ہے جو ہر عہد کی امتوں اور قوموں کے لئے ضروری ہوں، لہٰذا ہر وہ شخص جو قرآن مجید کو امام و ہادی سمجھتا ہے یہ کہہ کر پیچھا نہ چھڑائے کہ یہ تو گذرے ہوئے حالات ہیں۔ اسے چاہیئے کہ وہ ان آیات کے آئینہ میں اپنی اور اپنے معاشرہ کی صحیح شکل دیکھنے کی کوشش کرے۔

اس تمثیل کو سمجھنے کے لئے ذرا اس قوم کا نقشہ ذہن میں لایئے جو دور دراز تک پھیلے ہوئے لق و دق صحرا میں ہے اب عالم میں رات ہوتی ہے اور وہ اسے اپنی تاریکیوں میں چھپا لیتی ہے کہ اتنے میں گھٹا ٹوپ بادل اپنی بارش، بجلی اور گرج کڑک کے ساتھ آن پہنچتا ہے۔ اس ناگہانی خوف سے بچنے کے لئے وہ اپنی پوری انگلیوں کو کانوں میں ٹھونستے ہیں تاکہ کوئی آواز کان کی راہ سے نہ پہنچ سکے۔ وہ موت کے ڈر سے ایسا کرتے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی بزدلی ہی نہیں بلکہ انتہائی حماقت کی بھی دلیل ہے کیونکہ بجلی کی کڑک اور موت سے محفوظ رہنے کے لئے بچاؤ کی یہ کوئی صحیح شکل نہیں۔

یہ اس صنف کے لوگوں کے ایک ایسے گروہ کی مثال ہے جس کے افراد ہمیشہ سے نوعِ انسانی کے لئے فتنہ اور امتوں کے لئے مرض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے خام خیالات اور مروجہ رسومات کے بل بوتے پر دین کی صحیح تعلیمات کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ دین کے اس موروثی حصہ پر اکتفا کر لیتے ہیں جو انہیں اپنی بگڑی ہوئی شکل میں ملتا ہے۔ یہ لوگ اپنی عقلوں سے کھیلتے اور اپنے خیالات میں مگن رہتے ہیں۔ اور اپنے احساسات و شعور کی طاقتوں کو اس درجہ بے کار رہنے کا عادی بنا دیتے ہیں کہ وہ ناطاقتی کے باعث اپنی صلاحیتیں کھو دیتی ہے۔ یہ لوگ قوانینِ فطرت سے زور آزمائی کرتے ہیں اور بزعمِ خویش سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے انہیں مغلوب کر لیا۔ اس طرح ان میں سے بعض جمادات کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کی کیفیت (جیسا کہ پچھلی آیتوں میں بیان ہوا ہے) صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ کی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض طویل زمانہ تک تقلید کی تاریکیوں میں پرورش پانے کی وجہ سے سورج کی روشنی کے ساتھ چمگادڑوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ بہرحال

---

[1] قرآن نے جن امور کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے، انسان جوں جوں غور و فکر اور علم و بصیرت میں آگے بڑھتا ہے ان کے بلند سے بلند تر معانی سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے ان مقامات کی کوئی ایک تفسیر حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ (طلوعِ اسلام)

مؤخر الذکر فریق اول الذکر فریق سے نسبتاً بہتر ہے کیونکہ ان میں زندگی کی رمق اور امید کا ایک لمحہ باقی ہے جس کے باعث وہ ہدایت کے نور سے جب بھی وہ روشن ہوتا ہے کچھ رہنمائی حاصل کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ اور سیدھے راستے کے نظر آنے پر اس کی طرف چلنا چاہتے ہیں لیکن فوراً ہی ان کی راہ میں مروجہ رسمیں، تقلیدی بندشیں اور دوسری بدعتیں حائل ہو جاتی ہیں انھیں اس بلند تعلیم میں اپنے لئے جو پریشان کن پہلو نظر آتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ یہ تعلیم انھیں ان کے مانوس و مروج عقائد و رسوم سے باز رکھتی ہے۔ ان کے آباء و اجداد کے طریقوں کی کوئی رعایت اور ان کے کبراء و رؤسا کی عظمت کا قطعاً لحاظ نہیں کرتی۔ لہٰذا وہ خوف و رجاء، اور کفر و یقین کے درمیان ڈانواڈول رہتے ہیں لا الی ھٰؤلاء و لا الی ھٰؤلاء اور انھیں موت ہی اس کشمکش سے نجات دیتی ہے۔

نور پر ظلمات کے غالب آ جانے کا سبب یہ ہے کہ وہ عوام کے طریقے کی موافقت اور جمہور کی اتباع چاہتے ہیں۔ اپنے جذبات سے چمٹے رہتے ہیں، اور سطحی اور سامنے نظر آنے والی مصلحتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خدا کی مغفرت اور بخشش کی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے من گھڑت شفاعت کے عقیدے کا سہارا لیتے ہیں یعنی بغیر کچھ گرہ سے لگائے تجارت میں نفع کے خواستگار رہتے ہیں۔

یَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَیَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ ۚ اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِیْهِ ؟

یہ لوگ اپنے سامنے نظر آنے والے فوری مفاد کو لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں تو بخش دیا جائے گا اور اگر اسی جیسا اور مفاد بھی انھیں مل جائے تو اسے بھی وہ نہیں چھوڑتے۔ کیا ان سے کتاب اللہ کا یہ پختہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ کی طرف اس بات کو منسوب کریں جو حق ہو اور جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اسے پڑھتے رہیں؟۔

بلاشبہ کتاب تو اب بھی ان کے ہاں پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے، اور نہایت خوش الحانی و تجوید کے ساتھ، علم نحو اور علم کلام کی موشگافیوں کے ساتھ، یہ الگ بات ہے کہ اس کی حکمتوں اور حکموں کو بالائے طاق رکھ کر اس سے عقل و دل کی ہدایت کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔ اور اب اس کی قرأت حلال و حرام معلوم کرنے کے لئے نہیں بلکہ حقیر دنیاوی مفاد کی خاطر کی جا رہی ہے۔ اب اس کی تلاوت نفس کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے اور ایمان کو غذا دے کر اصلاح دل و زبان کا باعث نہیں بنتی۔ یہ جسمانی امراض سے شفا حاصل کرنے کے لئے تعویذوں اور وظیفوں میں لکھی پڑھی جاتی ہے، لیکن دلوں کے امراض و اوہام، خواہشات و معاصی کو دور کرنے کے لئے اس سے شفا حاصل نہیں کی جاتی۔ اگر ان میں کچھ کتاب اللہ کے حامی اور اس کی طرف دعوت دینے والے، اس کی پناہ میں آنے والے، اور اس کا سہارا لینے والے ہوتے تو یہ تاریکیاں چھٹ جاتیں اور رات کی روشنی رات کی تاریکیوں کو ختم کر دیتی۔

اس تمثیل میں تعلیماتِ الٰہی بمنزلہ بارش ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور اوپر بیان شدہ پریشانیاں اور اضطرابات بمنزلہ گرج ہیں۔ وہ روشنی جو ان کے دلوں میں پیدا ہو کر ان پر راہِ حق واضح کرتی ہے بمنزلہ برق ہے۔ صحیح عملی اقدام کرنے میں عوام کی مخالفت اور ان کی ملامت و مذمت کا خوف نیز مروجہ عادات و رسومات، جذبات و خواہشات بمنزلہ ظلمات ہیں جو راہِ حق پر گامزن ہونے میں حائل ہیں۔

اس آیت میں مشہور مفسر جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ "اَلرَّعْدُ"[1] ایک فرشتہ کا نام ہے یا اسکی آواز ہے اور "اَلْبَرْقُ"[2] اس کا کوڑا ہے جس کے ذریعہ وہ بادلوں کو ہانکتا ہے۔ اس طرح انھوں نے فرشتہ کو مادی جسم بنا دیا کیونکہ کانوں سے سنی جانے والی آواز مادی اور جسمانی خصائص میں سے ہے۔ گویا ان کے خیال میں بادل مریل ٹٹو ہیں جو بغیر ڈانٹ اور لگاتار مار کھائے بغیر چلتے ہی نہیں۔ در اصل رعد اور برق دو مشہور چیزیں ہیں جنھیں ہم گرج اور بجلی کہتے ہیں، اور ان دونوں لفظوں کے عربوں میں یہی متداول معانی تھے، اور یہ قطعاً جائز نہیں کہ ہم بغیر کسی قطعی اور صحیح دلیل کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں سے الگ کر کے دوسرے معانی میں لے جائیں۔ بالخصوص ایسی شکل میں تو صحیح دلیل کی اور بھی شدید ضرورت ہو جاتی ہے جبکہ ایک لفظ کو اس کے عام لغوی معنی سے ہٹا کر جن کا تعلق عالمِ شہود سے ہے عالمِ غیب کے کوئی معانی دیئے جائیں جن کا علم صرف ذات باری تعالیٰ کو ہے۔ یا پھر جسے وہ بذریعہ وحی ان معانی سے مطلع فرما دے لیکن ہمارے اکثر مفسرین اپنی تفسیروں میں ایسی موضوع روایات بھرنے کے عادی ہیں جن کو خود محدثین جھوٹی اور وضعی بتلاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی تفاسیر میں بے سر و پا قصے کہانیاں اور اسرائیلیات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ تاکہ ان کے ذریعہ قرآن کے مشکلات کی تفسیر و توضیح ہو۔ اور اس طرح یہ چیزیں وحی میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وحی میں ایسی چیز کا الحاق جائز نہیں جس پر اس کے الفاظ و اسالیب دلالت نہ کرتے ہوں الا یہ کہ وہ بات خود بذریعہ وحی ثابت ہو اور اسکے ثبوت میں قطعاً کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔

ہمارے لئے اسکی کوئی ضرورت نہ تھی کہ ہم رعد، برق اور صاعقہ[3] کے معانی بیان کرتے یا اس بحث میں الجھتے لیکن یہ سب کچھ ہم اس لئے لکھ رہے ہیں کہ مفسرین حضرات نے اس کے صحیح حقیقی معانی چھوڑ کر دماغوں کو دوسری طرف منتقل کر دیا ہے کہتے ہیں کہ ارسطو سے اسکے شاگردوں نے حرکت کی تعریف دریافت کی تو وہ کھڑے ہو کر چلنے لگا اور اس نے زبانی کوئی جواب نہ دیا حالانکہ عموماً لوگ فلسفیوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ سیدھی سادی اور صاف و واضح باتوں کو مشکل اور دقیق بنا کر پیش کریں۔

بعد ازاں بجلی سے متعلق مختصر سی بحث کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں:۔ بجلی کیونکر پیدا ہوتی ہے اور اس کے کیا اسباب ہوتے ہیں یہ موضوع قرآن کے مباحث سے خارج ہے کیونکہ یہ علم طبیعیات سے متعلق معاملہ ہے جس کا دار و مدار وحی پر نہیں ہے بلکہ انسان کائنات میں اپنی کوششوں سے غور و فکر کرنے کے بعد ان چیزوں کی حقیقتوں کو معلوم کر سکتا ہے۔

---

[1] یعنی گرج [2] بجلی [3] کڑک

اشتراکیت اور اسلام

[یہ مقالہ ہفتہ وار طلوع اسلام کی اشاعت بابت ۳۰ اپریل و ۷ مئی ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کیا جاتا ہے]

باطل کے مقابلہ میں حق کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ باطل اپنی کامیابی کے لئے ہمیشہ حق کا نقاب اوڑھ کر آتا ہے۔ اگر کوئی شخص آپ سے کسی بات کا وعدہ کرے اور ساتھ ہی یہ کہہ دے کہ وہ جھوٹا وعدہ کر رہا ہے تو آپ اس کے فریب میں کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ اپنی فریب دہی میں اس وقت کامیاب ہو سکیگا جب وہ وعدہ کرنے کے ساتھ ہی یقین دلادے کہ وہ بالکل سچا وعدہ کر رہا ہے اور قطعاً جھوٹ نہیں کہتا۔ یعنی جب تک وہ اپنے جھوٹ کو سچ کے نقاب میں پیش نہ کرے اس کا جھوٹ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ باطل کے مقابلہ میں بیشک یہ حق کی بڑی فتح ہے۔ لیکن باطل کی یہی روش دنیا میں تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بھی ہے۔ آپ دھوکا اس وقت کھاتے ہیں جب آپ کو یقین ہو کہ آپ کے ساتھ دھوکا نہیں کیا جا رہا۔ یعنی آپ باطل کے زہر کو اس وقت کھا سکتے ہیں جب وہ حق کی شکر میں لپٹا ہوا سامنے آئے۔ یوں تو باطل کا یہ حربہ کاروانِ انسانیت کے لئے قدم قدم پر رہزنی اور قزاقی کا موجب بنتا رہا ہے لیکن عصر حاضر میں اس کی غارت گری اور ہلاکت انگیزی نے جو شدت اور وسعت اختیار کی ہے اس کی مثال تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتی۔

وحی خداوندی نے انسان کو یہ بتایا تھا کہ

(۱) انسان کے ہر ارادہ اور ہر عمل کا ایک خاص اثر اور نتیجہ ہوتا ہے۔ جو ہر حال میں مرتب ہو کر رہتا ہے۔ اور اس سے اسکی ذات متاثر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر، ہر عمل ایک مستقل قدر (VALUE) رکھتا ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

(۲) انسان کی زندگی اس دنیا تک محدود نہیں۔ اس کا سلسلہ اس سے بھی آگے جاری رہتا ہے۔ اس لئے اعمال کے نتائج و اثرات کا سلسلہ بھی حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہوتا ہے۔ انسان ان اثرات سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔

(۲) یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے جس پر کوئی قوت غالب نہیں آسکتی۔ اس تصورِ حیات کا نام وحی کی اصطلاح میں ایمان باللہ و ایمان بالآخرت ہے۔

اس کے برعکس انسانی ذہن نے ایک تصور پیدا کیا جس کی رُو سے کہا گیا کہ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (۲۳/۳۷) زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ لوگ مرتے ہیں اور نئے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ سلسلۂ حیات و ممات بس اس دائرے کے اندر ہے۔ اس کے بعد زندگی کا تصور غلط ہے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے یہ عمارت استوار کر لی کہ جس کام میں انسان کا اپنا فائدہ ہو وہ اچھا جس میں اس کو نقصان ہو وہ بُرا ہے۔ اس لئے خیر اور شر کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ بالفاظ دیگر کوئی عمل اپنی ذات میں کوئی مستقل اور غیر متبدل قدر نہیں رکھتا۔ سب اقدار اضافی ہیں۔ اپنے فائدے یا نقصان کو اعمال کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ انسان جس قدر زیرک و چالاک، اور صاحب قوت و اقتدار ہو وہ اسی قدر اپنے اعمال کو اپنے حق میں فائدہ مند بنا سکتا ہے۔ انسان پر گرفت صرف سوسائٹی کی ہے۔ اس سے آگے اور کوئی قوت نہیں جس کی انسان پر گرفت ہو۔ اس تصورِ حیات کو مادی تصور (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ گذشتہ ادوار میں یہ تصور صرف افراد تک محدود رہتا تھا۔ یا بعض مفکرین کے محض دماغ تک۔ لیکن ہمارے دور میں (جس کی ابتداء یوں سمجھئے کہ انیسویں صدی سے ہوتی ہے) اس تصور نے ایک اجتماعی شکل اختیار کی اور ایک پوری تہذیب کی عمارت انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی۔ اس تہذیب کو "تہذیب مغرب" کہہ کر پکارا جاتا ہے کیونکہ اس کی ابتداء یورپ کی سرزمین سے ہوئی تھی۔ چونکہ دنیا کے بیشتر حصہ پر مغربی اقوام کو سیاسی غلبہ حاصل تھا۔ اس لئے اس تہذیب کا اثر عالمگیر ہوتا چلا گیا اور قریب قریب تمام اقوام عالم اس رنگ میں رنگی گئیں۔ لیکن اس کا سحر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، اس لئے کہ دنیا نے جلد ہی دیکھ لیا کہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

زبردست قومیں، زیردست قوموں کو نگلے جا رہی ہیں۔ جھوٹ اور فریب کا چلن عام ہو رہا ہے۔ دولت سمٹ کر ایک خاص (بالادست) طبقہ کے ہاتھ میں آ رہی ہے۔ غریب بُری طرح کچلے جا رہے ہیں۔ کمزور اور ناتوان کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ اس لئے لوگ اس تہذیب (یا مادی تصورِ حیات) سے متنفر ہونے شروع ہو گئے اور اس پر سخت تنقیدی نگاہیں پڑنے لگیں۔ ان کڑی تنقیدوں سے باطل نے محسوس کیا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ اُسے اس طرح بے نقاب سامنے نہیں آنا چاہیئے تھا۔ حق کے نقاب میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا چنانچہ اس نے اس قسم کا نقاب بُننا شروع کر دیا۔

یہ نقاب اس قسم کے نعروں پر مشتمل تھا کہ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ سرمایہ پرستی ہے۔ دولت کا چند افراد کے ہاتھوں میں محدود ہو جانا۔ نوع انسانی کے لئے موجب ہلاکت ہے۔ معاشرہ کا صحیح نقشہ یہ ہے کہ غریبوں اور کمزوروں، مزدوروں اور محنت

کشوں کو خاک کی پستیوں سے اٹھا کر بلند ترین سطح پر بٹھایا جائے۔ اس نقاب پوش مادہ پرستی یا (SUGAR - COATED) تہذیب مغرب کا نام اشتراکیت یا کمیونزم ہے۔ اس میں تصورِ حیات حرفاً حرفاً وہی ہے جو مغرب کے نظام سرمایہ پرستی نے پیدا کیا تھا اور جس پر اس کی ساری عمارت استوار ہے۔ یعنی

(۱) زندگی بس اس زندگی کا نام ہے۔ اس سے آگے کوئی زندگی نہیں۔

(۲) اعمال فی ذاتہٖ کوئی مستقل اقدار نہیں رکھتے۔

(۳) انسان پر، انسان سے اوپر کسی کی قوت کی گرفت نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک فلسفۂ زندگی یا تصورِ حیات کا تعلق ہے (جسے وحی کی اصطلاح میں ایمانیات کہتے ہیں) مغرب کے نظام سرمایہ داری اور روس کی کمیونزم میں کوئی فرق نہیں۔ اس اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف ان کے معاشی نظام میں ہے۔ کمیونسٹوں کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اس بنیادی تصورِ حیات یا فلسفۂ زندگی کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ صرف اپنے معاشی نظام کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور چونکہ یہ معاشی نظام ایسا ہے جو ہر اس شخص کے نزدیک باعثِ خیر و برکت ہے جس کے دل میں انسانیت کا ذرا سا بھی درد ہے (اور وحی خداوندی چونکہ انسانیت کی سب سے بڑی بہی خواہ ہے اس لئے اس نے خود اس قسم کا معاشی نظام تجویز کیا ہے) اس لئے ہر شخص ان کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس طرف اس کی نگاہ ہی نہیں جانے پاتی کہ یہ اسی تصورِ حیات کا پرچار ہے جس سے متنفر ہو کر اس نے سلامتی کا کوئی اور راستہ تلاش کرنا چاہا تھا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اشتراکیت درحقیقت باطل کے اس دیرینہ حربہ کی ایک شکل ہے جس کی رُو سے وہ حق کے نقاب میں سامنے آیا کرتا ہے۔ سطح بین لوگ کمیونسٹوں سے ان کے معاشی نظام (یعنی نقاب) سے بحث کرتے ہیں اور شکست کھا جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا نقاب مبنی علی الحق ہے۔ درحقیقت زیرِ بحث لانے کی چیز وہ فلسفۂ زندگی یا تصورِ حیات ہے جس پر ان کی تحریک کی بنیاد ہے۔ یہ تصورِ حیات اسلام کے یکسر نقیض ہے اور کوئی شخص بیک وقت اسلام کے تصورِ حیات (ایمان) کا معترف اور کمیونزم کے مسلک کا مؤید نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف کمیونزم کا بلکہ مغرب کے مادی تصورِ حیات کا مؤید۔ جس کے علمبردار یورپ اور امریکہ سب ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی صاحبِ نظر انکار نہیں کر سکتا۔

کمیونسٹوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کمیونزم کے فلسفۂ زندگی پر کیوں بحث کرتے ہیں۔ آپ اس کی طرف سے پیش کردہ نظام کو دیکھیں۔ اگر وہ نظام آپ کو صحیح نظر آتا ہے تو آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں۔ یہ بھی درحقیقت باطل کی نگاہ فریبی ہے۔ اسلام کی رُو سے کسی معاشی، سیاسی یا عمرانی نظام کو فلسفۂ زندگی سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عمل بلا ایمان کو کوئی وقعت نہیں دیتا اور ہمیشہ ایمان اور عمل کو یکجا رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ آپ کمیونزم کے فلسفۂ حیات کو تسلیم نہ کریں اور محض اس کے معاشی نظام کے لئے کمیونسٹ ہو جائیں۔ اسی سے اس بات کا جواب بھی مل جاتا ہے جو کمیونسٹوں کی طرف سے کہی جاتی ہے کہ بانیانِ اشتراکیت (مارکس، انجیلز وغیرہ) نے غریب دہی کی خاطر اس تحریک کو پیش نہیں کیا تھا۔ ان

کے دل میں انسانیت کا درد اور غریبوں کی ہمدردی کا جذبہ موجزن تھا جس سے انھوں نے نظام سرمایہ داری کو توڑنا چاہا! یہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا جذبہ محرکہ یہی ہو اور جب تک اس کے خلاف بیّن شواہد نہ ہوں ہمیں اس کے اعتراف میں کوئی باک نہ ہونا چاہیئے کہ ان کا جذبہ محرکہ ایسا ہی تھا)۔ لیکن غلط فلسفۂ زندگی تو بہرحال غلط رہتا ہے خواہ اسے قبول اور پیش کرنے والوں کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو۔ دنیا میں کتنی گمراہیاں ہیں جو نیک نیت انسانوں کی طرف سے پھیلائی ہوئی ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے (مارکس کے متعلق) کہا ہے کہ

زانکہ باطل در حق او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

علاوہ بریں قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ صحیح معاشی نظام، غلط تصورِ حیات کی بنیادوں پر کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ مارکس کی غلط نگہی یہ تھی کہ وہ ایک ایسے معاشی نظام کو جس میں نوعِ انسان کی بھلائی ہو اس مادی فلسفۂ زندگی کی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا تھا جس میں نوعِ انسانی کی بھلائی کی صلاحیت ہی نہیں۔ بہرحال ان حضرات کی نیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی (جسے اس کے نظام سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا) اسلام کے یکسر خلاف ہے بلکہ یوں کہیئے کہ یہی وہ تحریک ہے جو اسلام کے مقابلہ میں ایک دین (نظامِ زندگی) کی حیثیت سے اٹھی ہے۔ اس لئے ہر اس شخص کے لئے جس کے دل میں اسلام کا احترام (فلہٰذا نوعِ انسانی کی بہبود کا جذبہ) ہے ضروری ہے کہ وہ اس تحریک کا ہر طرح سے مقابلہ کرے۔ اگر خدانکردہ یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو (مسلمان تو ایک طرف) انسانیت کے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہے گی اور دنیا پھر ازمنۂ مظلمہ (DARK AGES) کی انسانیت سوز غلامی کی طرف لوٹ جائے گی۔

کمیونزم کے معاشی نظام کا بنیادی پتھر یہ دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی شخص غریب نہیں رہتا۔ کوئی بھوکا نہیں مرتا۔ اس میں امیر اور غریب کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اشتراکیت کے اس نگاہ فریب نقاب نے جہاں ایک طرف یہ نقصان پہنچایا ہے کہ یہ مادی نظریۂ حیات کی اس طرح پردہ پوشی کر دیتا ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ غریبوں اور مزدوروں کی حمایت کے جوش میں وہ کس تباہی کے جہنم کی طرف بہے جاتا ہے۔ دوسری طرف اس نے یہ صورت بھی پیدا کر دی ہے کہ جہاں کسی نے سرمایہ داری کی مذمت اور غریبوں اور محنت کشوں کی حمایت میں کچھ کہا، مفاد پرست گروہ نے فوراً کہنا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ خصوصیت صرف کمیونزم کو حاصل ہے کہ وہ نظام سرمایہ داری کی مخالف ہے۔ کمیونزم کے علاوہ ہر نظامِ زندگی اور تصورِ حیات، سرمایہ داری کے حق میں ہے۔ حتیٰ کہ اسلام بھی سرمایہ داری کے نظام کا مؤید ہے۔ ان حضرات کی یہ روش خود کمیونزم کو اس قدر تقویت پہنچا رہی ہے کہ مسلمان نوجوان کشاں کشاں اسکی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نظام سرمایہ داری کی ہلاکت خیزیاں اس قدر نمایاں ہو چکی ہیں کہ بجز ان لوگوں کے جن کی ذاتی مفاد پرستیاں انھیں اس سے وابستہ رکھنے پر مجبور کر رہی ہوں، کوئی صاحبِ قلبِ حساس اس کی حمایت نہیں کر سکتا

اور جب یہ نوجوان طبقہ سنتا ہے کہ اسلام سرمایہ داری کے نظام کی مخالفت نہیں کرتا تو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں پاتا کہ وہ کمیونزم کی آغوش میں جا کر پناہ لے۔

اب کچھ عرصے سے ہمارے ہاں ایک اور روش چل پڑی ہے اس کا نام ہے اسلامک سوشلزم۔ اس اصطلاح کے استعمال کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نظری طور پر نظام سرمایہ داری کی پوری پوری مخالفت کرتے جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی کمیونزم کو بھی اسلام کے نقیض قرار دیں گے۔ اس کے بعد بڑے فخر اور طمطراق سے کہیں گے کہ اسلام خود ایک سوشلزم کا نظام ہے جس میں نہ نظام سرمایہ پرستی کی تباہ کاریاں ہیں اور نہ ہی کمیونزم کی انسانیت سوز گمراہیاں۔ یہ ان دونوں سے الگ اپنا معاشی نظام رکھتا ہے جو تمام نوع انسانی کی مشکلات کا نہایت معقول حل پیش کرتا ہے۔ اس تمام دھواں دار تقریر اور خطیبانہ تحریر کے بعد جب آپ ان سے پوچھئے کہ اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے۔ ذرا اس کی تفاصیل بتائیے تو آپ حیران ہوں گے کہ ان کے ذہن میں صدقہ خیرات اور اڑھائی فیصدی زکوٰۃ سے آگے کچھ نہیں ہوگا۔ اور جب آپ ان سے کہیں کہ صاحب! اس سے نوع انسانی کی اقتصادی مشکلات کا حل کس طرح سے ہو جائے گا تو اس کے جواب میں وہ جھٹ سے کہہ دیں گے کہ یہ کمیونسٹ ہے۔

یہ ہے وہ صورت حالات جس سے ہماری قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سخت پریشان ہے۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کدھر جائے۔ ہمارا دور، معاشی دور (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ اس میں معاشیات نے اتنی اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ ویسے بھی معیشت، انسان کی حیات ارضی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کے متعلق صحیح پوزیشن کا سامنے آنا نہایت ضروری ہے۔ پاکستان میں اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اسے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا تھا کہ یہ اسلامی اقدار و نظام زندگی کی تجربہ گاہ بنے۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے، قائد اعظم مرحوم نے اپنی زندگی کی آخری تقریر میں (جو انہوں نے اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقع پر یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں کی تھی) فرمایا تھا۔

> مغرب کے اقتصادی نظام نے نوع انسانی کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا حل بمشکل مل سکتا ہے اور ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ نظر آتا ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کو جس تباہی کا سامنا ہے۔ اس سے اسے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ یہ نظام اس باب میں سخت ناکام رہا ہے کہ مختلف افراد میں عدل کیا جا سکے۔ اور اقوام عالم میں باہمی تصادم پیدا نہ ہو۔ اس کے برعکس، گذشتہ پچاس سال میں جو دو مہیب عالمگیر لڑائیاں ہوئی ہیں اس کی بیشتر ذمہ داری اس نظام پر عاید ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ آج اقوام مغرب، اپنی مشینی اور صنعتی ترقیوں کے باوجود جس پریشاں حالی میں ماخوذ ہیں۔ اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی

اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس اہم فریضے سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا۔ اور نوع انسانی کی بہبود مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا"۔

قائدِ اعظم مرحوم کی عمر نے الیفا نہ کی اس لئے انھیں یہ بتانے کی فرصت نہ مل سکی کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے اور اس "عدلِ عمرانی" کی تفصیل کیا ہے جس کی طرف انھوں نے اجمالاً اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں پاکستان کے ارباب حل و عقد بھی عدم تعین کے اس دوراہے پر کھڑے ہیں۔ جہاں یہ تشکیلِ پاکستان کے وقت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دستورِ پاکستان کی سفارشات میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مملکت کا اقتصادی نظام پچیس سال تک "کتاب و سنت" کے دائرہ سے باہر رہے گا۔ اس لئے کہ نہ خود انھیں معلوم تھا کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہوگا اور نہ ہی اسے ارباب شریعت متعین کر کے دے سکتے تھے۔

طلوع اسلام کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ وہ دیکھے اور بتائے کہ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کے متعلق قرآن کریم کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے اس سوال کو بھی اپنی فکر و تحقیق کا موضوع بنایا کہ قرآن کی رو سے نوع انسانی کا اقتصادی نظام کیا ہونا چاہیئے۔ اس باب میں اس کی قرآنی بصیرت اسے جن نتائج تک پہنچا سکی ان کا ذکر مختلف اوقات میں نجماً نجماً کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب اس پوری فکر کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، جس کا نام ہے "نظام ربوبیت"[1]۔ "طلوع اسلام" اسے اس درخواست اور آرزو کے ساتھ بحضور ملت پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہے کہ وہ اس پر نہایت سکون اور اطمینان سے غور کرے اور اگر سمجھے کہ اس میں قرآن کے اقتصادی نظام کو صحیح طور پر پیش کیا گیا ہے تو پھر سوچے کہ اس نظام کو عملاً کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ نظامِ ربوبیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کے اقتصادی نظام میں مملکت اس کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے رزق کے سرچشمے (وسائل پیداوار) افراد کی ذاتی ملکیت کی بجائے ملت کی اجتماعی تحویل میں بطور امانت رہتے ہیں۔ اس لئے مفاد پرست حلقوں کی طرف سے یہ شور اٹھایا جائے گا کہ یہ کمیونزم کی تبلیغ ہے (چنانچہ ربوہ والوں نے تو ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ طلوع اسلام کا تعلق روس کے ساتھ ہے اور یہی کچھ جماعت اسلامی والوں کی طرف سے مشہور کیا جا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب پنجاب میں زرعی زمینوں کی ملکیت کا سوال زیرِ غور تھا تو مرزا بشیر الدین محمود صاحب اور سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب دونوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے

[1] کتاب "نظامِ ربوبیت" اس عرصہ میں بڑی مقبول ہوئی ہے اور ملک کے ارباب فکر و نظر نے اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

کتابیں لکھی تھیں کہ زمین پر بلا حدود انفرادی ملکیت عین اسلامی شریعت کے مطابق ہے اور قانون کی رُو سے بڑے بڑے زمینداروں کی زمینداریاں ختم یا کم کر دینا مداخلت فی الدین ہے) ہم طلوع اسلام میں بہ تکرار لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ ہمارے نزدیک کمیونزم اور اسلام ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور کوئی شخص جو مسلمان ہونے کا دعویدار ہو وہ کمیونسٹ نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود ان کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ ہو گا کہ طلوع اسلام کمیونسٹ ہے تاکہ لوگ اس کی طرف سے پہلے ہی بدظن ہو جائیں اس بات کا ہمیں پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ طلوع اسلام نے یہ دعوت دی کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم ہونا چاہیئے چونکہ اس نظام کے قیام میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم ہو جاتا تھا اس لئے انھوں نے طلوع اسلام کی مخالفت شروع کر دی اگر اس مخالفت میں یہ حضرات طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی تعلیم کی تردید کرتے اور اسے غلط بتلاتے تو بھی ایک بات تھی لیکن یہ اسے غلط ثابت کر نہیں سکتے تھے اس لئے انھوں نے اپنی مخالفت کا رُخ بدلا اور یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام "منکر حدیث" اور "اہل قرآن" ہے مقصد اس سے یہ تھا کہ لوگ طلوع اسلام کی قرآنی دعوت کی طرف آنے ہی نہ پائیں۔ اس طرح یہ لوگ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ نظام ربوبیت کو قرآنی دلائل سے تو غلط ثابت نہیں کر سکتے اس لئے یہ پینترہ بدل کر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے کمیونسٹ مشہور کر دیا جائے۔ "لیبل تراشی" ان حضرات کا قدیمی فن ہے۔ ہمارے ہاں شروع سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ معتزلی ہے۔ یہ قدری ہے۔ یہ جبری ہے۔ یہ جہمی ہے۔ یہ مقلد ہے۔ یہ غیر مقلد ہے۔ یہ وہابی ہے۔ یہ دیوبندی ہے۔ یہ بریلوی ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہے جس کی مخالفت مقصود ہو، اس پر ایک لیبل لگا دو اور اس طرح ذہنوں کا رُخ اصل حقیقت پر غور کرنے کی بجائے، دوسری طرف موڑ دو۔ ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ان "لیبلوں" کے اثر میں نہ آئیں بلکہ "نظام ربوبیت" میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس پر بچشمِ خویش غور کریں۔ چہ عجب کہ ہماری اس کوشش سے اسلام کی وہ حقیقت آشکارا ہو جائے جس سے "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے" اور جنت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کی فردوسِ گم گشتہ پھر سے مل جائے۔

نظامِ ربوبیت کی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں فرد کی زندگی اسٹیٹ کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اسٹیٹ کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہو اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری نشوونما کے ذرائع بہم پہنچائے۔ جس سے وہ اس دنیا میں سرفرازی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اور اس کے بعد کی زندگی میں حیاتِ جاویدکے اہل بن سکیں نیز یہ نظام مستبدانہ طور پر خارج سے ٹھونسا نہیں جاتا۔ بلکہ یہ ان انسانوں کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ جو اس پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتے ہیں۔ نہ ہی اس کے قیام میں کوئی ایسا ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے جو اُن مستقل اقدار کے خلاف جائے جو اس نظام کی اصل الاصول ہیں۔

نظام ربوبیت

از

پرویز

۲۹۶ صفحات ——— مجلد -/5

اسلام کی سرگزشت

(مسلسل)

تیسرا درمیانی اسکول

ان دونوں اسکولوں کے درمیان میں ایک اور اسکول بھی تھا جو رائے اور قیاس کو قطعاً مہمل قرار نہیں دیتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حدیث سے بھی کافی سرمایہ دار تھا۔ یہ اسکول قیاس سے کام لیتا تھا مگر چند شرائط کے ساتھ اور صرف اس وقت جبکہ اس مسئلہ کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں ہوتی تھی۔ اس اسکول کے سربرآوردہ ائمہ میں امام مالکؒ اور پھر امام شافعیؒ کا نام آتا ہے۔

موضوع احادیث نے بھی فن تشریع کو بڑی مدد پہنچائی

رائے کے سلسلہ میں تحقیق و تنظیم نے کافی ترقی پائی اور اس کے لئے قواعد و شرائط وضع کئے گئے جس کا نام قیاس رکھا گیا۔ ان قواعد و ضوابط کے مرتب ہو جانے کے بعد رائے کا دائرہ بہت تنگ ہو گیا جو اکثر اوقات صرف اس حد تک محدود ہوتا تھا کہ کسی غیر منصوص مسئلہ کو منصوص مسئلہ سے تشبیہ دیدی جائے کیونکہ ان دونوں کے درمیان کوئی علت مشترک ہوتی تھی۔

باہم شدید اختلافات کے باوجود ان تینوں اسکولوں کی تحقیقات اور استنباطِ مسائل سے تشریع کے فن کو نمایاں ترقی ہوئی۔ حتیٰ کہ وہ حدیثیں بھی جو بذات خود گھڑی ہوئی اور موضوع تھیں، ہم یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ ان کا بھی تشریع اور قانون سازی کے فن پر کوئی کم احسان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حدیثیں یونہی اٹکل پچو نہیں گھڑی گئی تھیں اور نہ محض ایسی باتیں تھیں جو کسی نے کہدی تھیں بلکہ اکثر اوقات وہ گہرے فقہی تفکر اور بحث و اجتہاد کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ مگر بعد میں یہی رائے اور اجتہاد حدیث کا قالب اختیار کر لیتی تھی۔

اس عہد کی تاریخ تشریع

اب ہمیں اس عہد کی تشریع کی تاریخ پر ایک عام نظر ڈال لینی چاہیئے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں مدینہ منورہ مرکز خلافت تھا جہاں بڑے بڑے

وسیع العلم صحابہ موجود تھے۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے سامنے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے فیصلے کے لئے آتے تھے۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ ـــــ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں ـــــ ان مسائل میں جن کے متعلق کتاب اور سنت میں کوئی صریحی حکم نہیں ملتا تھا۔ بڑے بڑے صحابہ سے مشورہ فرمالیا کرتے تھے۔ صدیق اکبرؓ کے متعلق تاریخ میں کہیں نہیں ملتا کہ انھوں نے ملک کے کسی گوشے میں کوئی قاضی مقرر فرمایا ہو۔ البتہ یہ بات ضرور ملتی ہے کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ کے مشاغل امت کے حالات و مسائل کی وجہ سے بہت بڑھ گئے تو آپ نے تصفیہ طلب عدالتی امور کو حضرت عمرؓ کے حوالے فرما دیا تھا۔

حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور فتوحات میں لامحدود اضافہ ہوا تو آپ نے مختلف شہروں میں قاضیوں کو مقرر فرمایا۔ چنانچہ مصر، شام اور عراق میں اس قسم کے قاضی مقرر تھے جن کے ساتھ ہر شہر میں صحابہ اور تابعین کی جماعتیں موجود تھیں جنھیں اس شہر کی عادات، معاشی نوعیت، اجتماعی اور اقتصادی حالات کا علم ہوتا تھا جن میں وہ آکر آباد ہوئے تھے۔ ان کو قرآن کا علم حاصل تھا اور احادیث کا ذخیرہ بھی معتد بہ طور پر ان کے پاس موجود تھا۔ جہاں ان کو کتاب اور سنت میں کوئی صریح حکم نہیں ملتا تھا وہاں وہ رائے سے کام لیتے تھے۔ پیش آمدہ مسائل میں ان حضرات سے فتویٰ لیا جاتا اور یہ حضرات فتویٰ دیتے تھے۔ ان حضرات نے بہت سے امور میں فتوے صادر فرمائے جو آگے چل کر ہر شہر کا معمول بہا طریقہ بن گئے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ آئندہ پیش آنے والے مسائل میں ان سابقہ فتاویٰ کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مدینہ منورہ کے لوگ زیادہ تر حضرت عبداللہ بن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کی پیروی کرتے تھے مکہ مکرمہ کے لوگ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کی، کوفہ کے لوگ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کی اور مصر کے لوگ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کی۔

جوں جوں نئے نئے حالات اور مسائل پیش آتے جاتے تھے۔ ان فتاویٰ کی کثرت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا کیونکہ پہلے سے فتویٰ اور علماء کے اجتہادی فیصلے موجود نہ ہونے کی وجہ سے ایسے نئے مسائل میں علماء کو نئے نئے فیصلے کرنے پڑتے تھے۔

بنو امیہ کی حکومت ہوئی تو مرکز خلافت شام میں دمشق کے مقام پر منتقل ہوگیا۔ اس عہد میں اس آمیزش و اختلاط کا اثر نمایاں ہونے لگا تھا جو عرب فاتحین اور اقوام مفتوحہ کے درمیان چلی آرہی تھی۔ اس آمیزش اور اختلاط کا حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

مفتوحہ اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط کے اثرات

اس اختلاط اور آمیزش کو اس بات نے اور بھی تقویت پہنچائی کہ مسلمان صحیح معنی میں دوسری قوموں کے ساتھ تسامح اور چشم پوشی کا بہترین مظاہرہ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی سیرت اس کی بہترین شاہد ہے۔ جبر و تشدد اور بد معاملگی بعد میں پیدا ہوئی۔ اس کا یہ اثر تھا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں طرح طرح کی ذہنیتیں، قسم قسم کے

یہاں وہ مذاہب اور انواع و اقسام کے مختلف نظامہائے زندگی آتے تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو سوالات کرنے کی نوبت آتی تھی کہ اس صورت میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ ان مدنیتوں نے جو یہ بے شمار جزئیات اور مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے متعلق اسلام کی کیا رائے ہے؟ اسلام کسے پسند کرتا ہے اور کسے ناپسند کرتا ہے۔ ان میں سے کون سی چیز اسلام کے قواعد کلیہ سے مطابقت کھاتی ہیں اور کون سی چیزیں مطابقت نہیں کھاتیں۔ ان مشکلات کے سامنے فقہاء کا موقف کوئی آسان موقف نہیں تھا بلکہ نہایت دشوار اور مشقت آمیز تھا۔ یہی حضرات تھے جنہوں نے مسلمانوں کی جانب سے اس دشوار بوجھ کو اٹھایا اور خنداں پیشانی کے ساتھ اس بار سے عہدہ برآ ہوئے۔

مستشرقین کی غلط فہمی

بعض مستشرق محققین مثلاً "گولڈزیہر" اور "ساتلانا" اس طرف گئے ہیں کہ اس عہد میں فقہ اسلامی نے رومن قانون سے بڑا گہرا اثر لیا اور رومی فقہ اسلامی فقہ کے سرچشموں میں سے ایک بڑا سرچشمہ تھا۔ اسلام نے اس کے بعض احکام قبول کر لئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی فتوحات کے وقت شام میں قیصریہ اور بیروت کے مقامات پر ایسے مدارس موجود تھے جہاں رومی قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں ایسے محکمے بھی موجود تھے جو اپنے نظام اور احکام میں رومی قانون کے مطابق چلتے تھے۔ اسلامی فتوحات کے بعد بھی ان شہروں میں یہ محکمے زمانہ دراز تک قائم رہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عین فطرت ہے کہ جب کوئی ایسی قوم جسے مدنیت سے وافر حصہ نہ ملا ہو ایسے ممالک کو فتح کر لیتی ہے جو مدنیت اور تہذیب میں کوئی مقام رکھتے ہوں تو یہ لوگ طبعاً یہ دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ مہذب ممالک مختلف معاملات میں کیا کرتے ہیں۔ کس طرح فیصلے کرتے ہیں اور پھر ان کے فیصلوں سے وہ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ بعض اسلامی فقہ کے ابواب اور رومی فقہ کے ابواب میں ہمیں ایسی مشاکلت اور مقاربت ملتی ہے جو ہمارے اس دعوے کے ثبوت میں کافی سے بھی زیادہ ہے۔ بلکہ اسلامی فقہ کے بعض بنیادی قواعد ایسے ہیں جو صراحۃً رومی قانون سے لئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ قاعدہ کہ گواہی اور ثبوت پیش کرنا مدعی کا کام ہے۔ اور مدعا علیہ کے ذمہ قسم کھانا ہے: حتیٰ کہ فقہ اور فقیہ کے الفاظ بھی مسلمانوں میں اس لفظ کے معنی کے مطابق ہی استعمال ہوئے ہیں جو رومیوں کے ہاں اس مقصد کے لئے مستعمل تھا وہ معنی JURIS کا لفظ استعمال کرتے تھے جس کے معنی فہم، معرفت اور حکمت کے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی فقہ یا تو رومی قانون سے براہ راست ماخوذ ہے یا تالمود کے راستہ اس سے متاثر ہوا ہے کیونکہ تالمود نے رومی قانون سے بہت کچھ لیا ہے۔ مسلمانوں کو چونکہ یہودیوں کے ساتھ کافی اتصال رہا ہے۔ اس لئے ان کے واسطے تالمود کے بہت سے اقوال لے لینا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اسی طرح کی باتیں بیان کی ہیں۔

ہماری رائے میں جو دلائل ان لوگوں نے بیان کئے ہیں۔ وہ کافی نہیں ہیں کیونکہ دو قانونوں میں بعض احکام کا ایک دوسرے سے مشابہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل نہیں ہے کہ ایک قانون دوسرے قانون سے ماخوذ ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جبکہ اس بات کی رعایت بھی رکھی جائے کہ یہ قوانین ——— خواہ الٰہی ہوں یا خود ساختہ ہوں ——— قانون سازی کے

معاملہ میں عدالت کی پوری رعایت رکھتے ہیں۔ ایسے امور ہو سکتے ہیں جن کی عدالت واضع ہو اور ان میں تمام قانون ساز اتفاق کے ساتھ ایک سا ہی فیصلہ کریں۔ جیسے مثلاً یہ قاعدہ کہ گواہی اور ثبوت پیش کرنا مدعی کا کام ہے اور مدعا علیہ کے ذمہ قسم کھانا ہے۔ نیز لفظ "فقہ" کے معنی عربی زبان میں دراصل کسی چیز کو جاننے اور سمجھنے کے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ دینی علم اور دینی فہم پر زیادہ تر بولا جانے لگا جیسا کہ شعر کا لفظ خاص قسم کی معروف باتوں پر بولا جانے لگا۔ "فقہ" کے لفظ کو انہی معنوں میں قرآن کریم نے اس وقت بھی استعمال کیا تھا جبکہ مسلمانوں کا رومیوں کے ساتھ قطعاً کوئی اختلاط نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ ؕ (ہر جماعت میں سے کچھ لوگ اس مقصد کے لئے کیوں اٹھ کھڑے نہیں ہوتے کہ وہ دین میں سمجھ اور فہم حاصل کر سکیں) پھر یہ لفظ اس قسم کے خاص علم (علم التشریع) پر بولا جانے لگا۔ کیونکہ اس علم کا تقاضا تھا کہ دین میں غور و فکر کیا جائے اور کتاب و سنت کی معرفت حاصل کی جائے۔ علوم کے نام عربوں نے عام طور پر اسی طرح کے رکھے ہیں کہ وہ الفاظ عام ہوتے تھے اس کے بعد وہ کسی خاص فن کے ساتھ مخصوص ہو جاتے تھے۔ ہمیں قانون ساز ائمہ میں سے کسی کے ہاں بھی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے ان مستشرقین کے قول کی تصدیق ہو سکے۔ ان ائمہ نے رومی قانون کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا نہ تنقید کے طور پر نہ تائید و اقتباس کے طور پر۔ رومی قانون سے اگر کوئی قانون ساز متاثر ہو سکتا تھا تو امام اوزاعی کے لئے اس کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل تھے۔ وہ بیروت میں رہے جو شام میں رومی اسکول کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ امام اوزاعی شام کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ بعض مستشرقین کو بھی اس کا اعتراف ہے چنانچہ انھوں نے کہا ہے کہ یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ امام اوزاعی کا مذہب صفحۂ ہستی سے نابود ہو گیا ورنہ ان کی فقہ میں رومی فقہ کے اثرات نمایاں طور پر ملنے چاہئیں تھے لیکن ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ بات بھی کوئی وقیع نہیں ہے۔ کیونکہ امام اوزاعیؒ کے مذہب کا بڑا حصہ کتاب الام کی ساتویں جلد میں موجود ہے۔ اور ان کے مذہب کا مطالعہ کرنے کے بعد میری رائے تو یہ ہے کہ امام اوزاعیؒ کو حدیث کے اسکول سے وابستہ ماننا پڑتا ہے نہ کہ رائے کے اسکول سے۔ اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو یہ گولڈزیہر کی رائے سے قطعاً برعکس ہے کیونکہ حدیث کا اسکول رومی قانون سے اثر پذیری میں بعید ترین اسکول ہو سکتا ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ رومی قانون نے اسلامی فقہ کو ایک دوسرے گوشے سے بہت فائدہ پہنچایا۔ وہ گوشہ یہ تھا کہ فقہاء کے سامنے مسائل پیش کئے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے بارے میں شریعت اسلامیہ کے قواعد کلیہ کے ماتحت اپنی رائے ظاہر کریں۔ یہ بات ثابت ہے کہ مصر اور شام میں، اسلام سے پہلے رومی محکمے رومی قانون کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔ جب اسلام آیا اور ان محکومین میں سے کچھ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور جو اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے وہ بھی قانونی طور پر اسلام کے مطیع ہو چکے تھے تو ان حالات کا یہ فطری تقاضا تھا کہ وہ اپنی قدیم طرزِ بود و ماند اور اپنے قدیم محکموں کی آراء کو اسلام کے سامنے پیش کرتے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ ان میں کونسی چیزیں برقرار رکھی جا سکتی ہیں اور کون سی چیزیں

برقرار نہیں رکھی جاسکتیں۔ آپ موجودہ زمانہ میں دیکھ لیجئے کہ یہی امر آج بھی مصری قانون میں تبدیلیوں کا باعث بن رہا ہے اور جدید یورپین قوانین کی وجہ سے مصری قانون میں نئی نئی بنیادیں تلاش کی جارہی ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اہل معاملہ لوگ اور قاضی حضرات جواب سے پہلے قدیم قانون کے مطابق دعوے دائر کرتے اور فیصلے کرتے تھے اب ان مسائل کو ابھارتے اور لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور قدیم تعلیمات اور جدید تعلیمات میں موازنہ کرتے تھے — خصوصیت کے ساتھ جب ہم اس امر کو بھی ملحوظ رکھیں کہ ابتدائی عہد اسلام کے قاضی کسی حد تک قانونی بصارت کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک تسامح اور چشم پوشی کے بھی عادی تھے۔ بشرطیکہ انھیں اسلامی قواعد و ضوابط سے باہر نہ نکلنا پڑے۔ چنانچہ میں نے کتاب "قضاۃ مصر" کے حاشیہ پر یہ عبارت پڑھی ہے کہ خیر ابن نعیم (جو ۱۲۰ھ سے ۱۲۷ھ تک مصر کے قاضی رہے) قبطیوں کی باتیں ان کی زبان میں، ان سے سنتے اور انہی کی زبان میں ان سے گفتگو کرتے تھے۔ گواہوں کی شہادتیں بھی اسی طرح ان کی زبان میں ہوتی تھیں اور ان کی شہادتوں کے مطابق وہ فیصلے کیا کرتے تھے[1]

خلفائے بنو امیہ نے فن تشریع کی ترقی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا

اس عہد — یعنی دولت امویہ کے عہد — میں ہم خلفائے بنو امیہ کو تشریعی حالات کا اہتمام کرتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ یہ اہتمام ہمیں ان کے ہاں بہت کم — مثلاً عمر بن عبدالعزیز کے ہاں — نظر آتا ہے۔ فقہ اور تشریع کے کام نے ان کے دور میں خلفاء کی حمایت اور سرپرستی کے ماتحت کوئی ترقی نہیں کی جیسا کہ عباسی دور حکومت میں نظر آتا ہے۔ اموی عہد حکومت میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ علماء کے مدارس اور علقہ ہائے درس کی وجہ سے ہوئی جو خلفاء کے اثر سے بڑی حد تک آزاد تھے۔ اموی خلفاء نے اپنے عہد کی قانون سازی کو کبھی رسمی رنگ دینے کی بھی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اموی دور حکومت میں ہمیں ابو یوسف قاضی جیسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جو عباسی دور حکومت میں ہمیں ملتی ہے کہ خلفاء ان کی حمایت کرتے اور قانون سازی کے کام میں ان کی تائید کرتے اور اپنے اور ان کے درمیان تعلقات کو ساتھ ہی ان کے اور دوسرے قاضیوں کے درمیان تعلقات کو محکم سے محکم تر کرنے کی فکریں لگے رہتے تھے۔ قانون ساز ائمہ میں شاذ و نادر ہی — امام زہریؒ کی طرح کے — وہ لوگ ملتے ہیں جو خلفاء بنو امیہ کے ساتھ کسی طرح کا کوئی اتصال اور وابستگی رکھتے ہوں۔

اس عہد میں مذاہب اربعہ نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔ وہاں بہت سے مجتہد امام ہوا کرتے تھے جیسے امام اوزاعیؒ وغیرہ جن کے مذاہب صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئے۔ البتہ ائمہ اربعہ میں سے دو امام، اموی دور حکومت کے آخری دنوں میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ عراق میں امام ابو حنیفہؒ اور مدینہ منورہ میں امام مالک بن

امام ابو حنیفہ رح

---

[1] تاریخ قضاۃ مصر لکندی کا حاشیہ صفحہ ۳۴۹

الخ۔ امام ابو حنیفہؒ سنہ ۸۰ھ میں عبد الملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے اور تقریباً زندگی کے اٹھارہ سال عباسی حکومت کے زیرِ سایہ گذارے۔ آپ ایرانی نژاد تھے۔ فقہ کی تعلیم علوی گھرانے میں امام جعفر صادقؒ سے اور دوسری طرف امام نخعیؒ سے حاصل کی جو اپنے عہد کے بہت بڑے فقیہ تھے۔ شعبیؒ، اعمشؒ اور قتادہؒ سے حدیث سنی۔ آپ نے اپنی قانون سازی کی قدرتِ تامہ، قوتِ استدلال، خوبیٔ کلام، اور دقتِ استنباط کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اہل الرائے کے اسکولِ فقہ کے امام تسلیم کئے گئے۔ ان کی قانونی تصنیفات میں سے ہم تک ان کی کوئی کتاب نہیں پہنچی۔ اور نہ ہی تاریخی طور پر یہ ثابت ہو سکا کہ انھوں نے اپنے مذہب کو کسی کتاب میں مدون کیا تھا۔ یہ کام دراصل ان کے بعد ان کے دونوں ممتاز اور نامور شاگردوں — ابو یوسفؒ اور محمدؒ — نے سر انجام دیا۔

امام مالکؒ

امام مالکؒ مدینہ منورہ میں سنہ ۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ عربی نژاد تھے۔ مدینہ منورہ میں ہی آپ نے تعلیم پائی اور وہیں تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ حدیث میں حجت اور سند ہونے کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند تھا اسی وجہ سے وہ اہل حدیث کے اسکول کے امام مانے جاتے ہیں۔ ان کے مذہب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ امام ابو حنیفہؒ سے زیادہ حدیثوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اہل مدینہ کے عمل کو بھی حجت اور سند کا درجہ دیتے ہیں۔ آپ کی وفات سنہ ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ آپ نے اپنے بعد ہمارے لئے اپنی کتاب "الموطا" چھوڑی ہے۔ موطا کے متعلق مشہور تو یہ ہے کہ وہ حدیث کی کتاب ہے مگر درحقیقت وہ فقہ کی کتاب ہے۔ اگرچہ حدیثوں سے بھری ہوئی ہے۔ امام مالکؒ کا مقصد مؤطا کی تالیف سے اپنے زمانہ کی مشہور و معروف اور صحیح و ثابت شدہ حدیثوں کو اپنی اس کتاب میں جمع کر دینا نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد قانون سازی کے نتائج کو حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بیان کرنا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مؤطا میں ہمیں ان کے شخصی فتاویٰ اور بعض مسائل میں ان کی آراء بکثرت ملتی ہیں۔

ہم یہاں ان دونوں اماموں کے زاویہ ہائے نظر کے فرق اور ان اصولی اختلافات کو جن پر انھوں نے اعتماد فرمایا ہے بیان کر کے بات کو بڑھانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ تفصیل عباسی عہد حکومت سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ مگر ہم یہاں ایک باریک نکتہ بیان کر دینا چاہتے ہیں جس کو ابن خلدون نے بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ مغرب اور اندلس میں امام مالکؒ کے مذہب کے پھیل جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "نیز یہ وجہ بھی تھی کہ اہل مغرب اور اہل اندلس پر بادیہ نشینی غالب تھی۔ وہ اس تہذیب و حضارت سے ناآشنا تھے۔ جس سے اہل عراق متعارف تھے۔ لہٰذا ان کا میلان حجاز کی طرف زیادہ تھا۔ کیونکہ ان میں اور اہل حجاز میں بداوت ایک وجہ مشترک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب مالکی ان کے ہاں ہمیشہ سرسبز رہا اور اس پر حضارت اور تہذیب کی قطع و برید کا کوئی اثر نہیں پڑ سکا جیسا کہ دوسرے تمام مذاہب پر پڑا ہے[1]"

ابن خلدون یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس شہر کی مدنیت یا بداوت کا جس میں کوئی خاص امام پیدا ہوا اور پلا بڑھا

[1] مقدمہ صفحہ ۳۷۵

ہے اس کے مذہب کے قوام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ زودعلت کی کثرت وقلت بھی اسی کی رہین منت ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی رائے کی تکوین میں بھی اس کا نمایاں اثر ہوتا ہے۔ اگر ہم ان فقہا کے بعض باہمی اختلافات کو سامنے رکھیں تو یہ بات ہمیں بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آسکتی ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ "اللہ اکبر" کہنے کے بجائے اس کے فارسی ترجمہ کے ساتھ نماز شروع کرلی جائے۔ اگرچہ کہنے والا اللہ اکبر کہنے پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ ایسے ہی امام ابوحنیفہؒ قرآن کی قرأت نماز میں فارسی زبان میں کرلینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جبکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس مسئلہ میں ان کے خلاف گئے ہیں[1]۔ یا مثلاً امام ابوحنیفہؒ ایک آزاد اور جوان عورت کے لئے بغیر ولی کے اپنا نکاح خود کرلینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ولی کے بغیر وہ اپنا نکاح نہیں کرسکتی[2]۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رجحان یعنی امام کا ان حالات سے اثر پذیر ہونا جو اسے محیط ہوتے ہیں اور اس کی رائے پر ان حالات کا اثر انداز ہونا ان مواقع پر ہی ہوتا ہے جہاں امام کے پاس صحیح سند سے کتاب اور سنت کا کوئی صریح حکم نہ پہنچا ہو۔ اگر صحیح سند سے کوئی صریح حکم پہنچ گیا ہو تو پھر اس کی رائے کی تکوین پر ان حالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس بات کی دلیل مثلاً یہ حقیقت ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں ہم دیکھتے ہیں کہ شادی بیاہ میں نسبی کفاءت اور برابری کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قریش ان کے مذہب میں قریشی کا کفو ہے لیکن باقی عرب قریشی خاندان کے کفو نہیں ہیں۔ اسی طرح موالی، عربوں کے کفو نہیں ہیں۔ باوجودیکہ امام مالکؒ اس کے برعکس اس کے قائل ہیں کہ کفاءت اور برابری کا اعتبار محض دین میں ہوسکتا ہے نسب وغیرہ میں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد صحیح سند کے ساتھ ثابت ہوگیا ہے کہ "سارے آدمی ایسے ہی برابر ہیں جیسے کنگھی کے دندانے۔ کسی عربی آدمی کو کسی عجمی آدمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت محض تقویٰ کی وجہ سے ہے[3]"۔ اب آپ دیکھئے کہ اگر معاملہ صرف حالات کے اندازہ کا ہوتا تو ان دونوں مذاہب کے فیصلے اس کے برعکس ہوتے جو اب نظر آتے ہیں۔

ان کتابوں کی فہرست جن سے اس فصل کی تدوین میں مدد لی گئی

۱۔ المستصفیٰ للغزالی

۲۔ مسلم الثبوت

۳۔ صحیحین۔ بخاری و مسلم

۴۔ مقدمہ ابن خلدون

۵۔ الموافقات للشاطبی

۶۔ تاریخ ولاۃ مصر وقضاتہا للکندی

---

[1] زیلعی صفحہ ۱۰۹ جلد ۱ [2] زیلعی صفحہ ۱۱۷ جلد ۲ [3] زیلعی صفحہ ۱۲۸ ۔ ۱۲۹ جلد ۲

۷۔ خطط المقریزی

۸۔ تفسیر طبری

۹۔ العقد الفرید لابن عبد ربہ

(۱۰) تیسیر الوصول فی جمع احادیث الرسول

(۱۱) اسباب النزول للواحدی

(۱۲) التفسیرات الاحمدیہ فی الآیات الشرعیہ

۱۳۔ اعلام الموقعین لابن القیم والطرق الحکمیۃ لابن القیم

۱۴۔ شرح الزیلعی علی متن الکنز

۱۵۔ فتح القدیر علی الہدایہ

۱۶۔ الام للامام الشافعیؒ

۱۷۔ نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ للزیلعی

۱۸۔ وفیات الاعیان لابن خلکان

۱۹۔ الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب لابن فرحون

۲۰۔ تاریخ التشریع الاسلامی للمرحوم الشیخ محمد الخضری

۲۱۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ در مادہ "فقہ"

۲۲۔ ABDUR-RAHIM, MUHAMMADAN JURISPRUDENCE

۲۳۔ Macdonald. Muslim Pheology

۲۴۔ Goldziher, Le Dogma et Le Loi de L' Islam.

استدراک

مصنف نے صفحہ ۵۶ پر نزولِ قرآن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآنی احکام کے نزول کی شکل یہ تھی کہ لوگوں نے نبی اکرمؐ سے جو جو باتیں پوچھیں ان کے متعلق احکام نازل ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

(۱) اگر لوگ ان امور کی بابت دریافت نہ کرتے تو قرآن میں ان کی بابت کچھ نازل نہ ہوتا۔

(۲) نبی اکرمؐ اگر کچھ مدت اور زندہ رہتے اور نزولِ قرآن کا سلسلہ جاری رہتا تو وہ لوگ اس قسم کی اور باتیں بھی پوچھتے اور ان کے متعلق احکام بھی نازل ہو جاتے۔ چونکہ انھیں اس کا موقعہ نہ ملا اس لئے قرآن میں ان امور کے متعلق احکام شامل نہ ہو سکے۔

(iii) وہ لوگ بہرحال، انہی امور کے متعلق باتیں دریافت کر سکتے تھے جو انھیں اس زمانے میں پیش آسکتے تھے۔ اگر قرآن ہمارے زمانہ میں نازل ہوتا تو لوگ اور قسم کی باتیں پوچھتے (کیونکہ ہمارے زمانے کے تقاضے کچھ اور ہیں) لہٰذا قرآن کے احکام تاریخ کے ایک خاص دَور سے متعلق ہیں۔

قرآن کے متعلق یہ تصور یکسر غلط ہے۔ قرآن مشیت خداوندی کے پروگرام کے مطابق، تمام نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے نازل ہوا۔ خدا کو انسانی راہ نمائی کے لئے مستقل طور پر جس قدر احکام دینے تھے وہ سب اس میں آگئے ہیں اور وہ تمام زمانوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض امور کے متعلق لوگوں نے دریافت بھی کیا اور اس کے بعد ان سے متعلق احکام نازل ہوئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر وہ لوگ ان امور کے متعلق دریافت نہ کرتے تو یہ احکام نازل ہی نہ ہوتے۔ یہ احکام، جو ابدی حیثیت رکھتے ہیں، پھر بھی نازل ہوتے جس طرح اور سینکڑوں احکام ایسے نازل ہوئے جن کی بابت انھوں نے دریافت نہیں کیا تھا۔ قرآن خدا کی طرف سے تمام نوع انسانی کے لئے مکمل اور آخری ضابطۂ ہدایت ہے۔ اور زمان اور مکان کی قید سے ماورا ہے۔

مصنف نے صفحہ ۵۹ پر یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کی بعض آیات منسوخ ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ انھوں نے جو آیات اپنے خیال کی تائید میں پیش کی ہیں ان کا تعلق اقوام سابقہ کی شریعتوں سے ہے جن میں سے بعض احکام کو قرآن نے منسوخ کیا اور جنھیں لوگوں نے ضائع کر دیا تھا وہ قرآن میں از سر نو آگئے۔

انھوں نے (ناسخ و منسوخ کی) مثال میں جو دو آیات نقل کی ہیں ان سے بھی ان کے خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ وہ آیات دو الگ الگ احکام ہیں جن میں سے کوئی بھی منسوخ نہیں۔ ایک آیت میں کہا گیا کہ "جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنے آپ کو چار مہینہ اور دس دن تک انتظار میں رکھیں۔" (۲/۲۳۴)۔ اس آیت میں بیوہ کی عدت کا ذکر ہے کہ وہ چار ماہ دس دن تک عقد ثانی نہ کرے۔ دوسری آیت میں ہے "جن لوگوں کی تم میں سے وفات ہو جائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے لئے وصیت کر جائیں کہ انھیں سال بھر تک گھر سے نہ نکالا جائے اور انھیں ضروریات کی چیزیں بہم پہنچائی جائیں۔ لیکن اگر وہ (اس سے قبل) خود چلی جائیں تو وہ جو کچھ اپنے حق میں کریں اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔" (۲/۲۴۰) اس آیت میں کہا گیا ہے کہ بیوہ کو سال بھر تک خرچ دیا جائے اور اسے گھر سے نہ نکالا جائے۔ یعنی اگر کوئی بیوہ چار ماہ دس دن تک کی مدت کے بعد شادی نہیں کرتی تو سال بھر تک اس کے اخراجات کی ذمہ داری متوفی کے وارثوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ دوران سال میں دوسری جگہ شادی کر لے (یا اپنا کچھ اور انتظام کر لے) تو پھر یہ ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ دوسری آیت پہلی آیت کو منسوخ نہیں کرتی۔ یہ الگ اور مستقل حکم ہے۔

صرف چند نسخے باقی ہیں

جشن نامے
دو روپے آٹھ آنے

نوادرات
چار روپے

اسلامی نظام
دو روپے

قرآنی فیصلے
چار روپے

اسلام میں قانون سازی کا اصول
دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول
چار روپے

تاریخ الامت (جلد سوم)
دو روپے

تاریخ الامت (جلد چہارم)
دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵- بی گل برگ کالونی — لاہور

باب المراسلات

۱۔ نظامِ ربوبیت میں جبر

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

طلوعِ اسلام اور اس کے شائع کردہ لٹریچر میں اسلامی نظام کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا ہے، میں ایک عرصہ سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں اور بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ صحیح اسلام کو پیش کرنے کی یہ پہلی اور بے مثال کوشش ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ دین کا مقصود "نظامِ ربوبیت" کا قیام ہے جس میں تمام افراد کے جسم اور ذات کی نشو و نما ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسانیت کے لئے اس سے بہتر نظام تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

اس سلسلہ میں عام طور پر ایک اعتراض کیا جاتا ہے جس کے تسلی بخش جواب کے لئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس نظام میں ہر فرد اپنی محنت کی کمائی سے اپنے لئے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھ سکتا ہے۔ اور باقی ماندہ مملکت لے لیتی ہے۔ اس میں جبر پایا جاتا ہے۔ حالانکہ انسانی ذات کی نشو و نما جبر سے نہیں بلکہ اس عمل سے ہوتی ہے جو لطیبِ خاطر کیا جائے۔ براہِ کرم اس کا جواب (طلوعِ اسلام کی وساطت سے) مرحمت فرمائیں۔

طلوعِ اسلام:- "نظامِ ربوبیت" میں جبر کا تصور، قرآنی تعلیم کو کماحقہ نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سوسائٹی ہے جس نے اپنے قواعد و ضوابط میں یہ شق رکھی ہے کہ جو شخص اس کا ممبر بننا چاہے اسے اپنی آمدنی کا دسواں حصہ سوسائٹی کے فنڈ میں دینا ہوگا۔ ایک شخص، سوسائٹی کے جملہ قواعد و ضوابط کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد اپنی خوشی سے فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اس کا ممبر بنے گا۔ وہ اس کا ممبر بن جاتا ہے اور ہر ماہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اس کے فنڈ میں دیتا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی ماہ اس میں ناغہ کرتا ہے یا تساہل برتتا ہے تو سوسائٹی کی طرف سے اس کا مطالبہ ہو جاتا ہے اگر وہ دینے سے انکار کرتا ہے تو سوسائٹی اسے کہہ دیتی ہے کہ وہ ممبر شپ سے الگ ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ اس شخص کا سوسائٹی کے فنڈ میں اتنا روپیہ دینا، اور عدم ادائیگی کی صورت میں سوسائٹی کی طرف سے اس کا مطالبہ پیش ہونا جبر کہلا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس میں جبر کا شائبہ تک نہیں۔ جبر اس صورت میں ہوتا اگر اسے سوسائٹی

کا ممبر زبردستی بنایا جاتا۔ جو شخص بطیب خاطر کسی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے وہ سوسائٹی کے قواعد وضوابط کی پابندی بہ طیب خاطر کرتا ہے۔ یہ اُن پابندیوں کا ملحوظ رکھنا ہے جو اس نے ازخود اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔

اسلام ایک سوسائٹی کا نام ہے جس کے قواعد وضوابط میں (منجملہ دیگر شرائط) ایک شق یہ بھی ہے کہ اس کا ممبر اپنا مال اور جان اللہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے (۹/۱۱۱) ایک شخص ان قواعد وضوابط کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد فارم رکنیت پر دستخط کر کے اس سوسائٹی کا ممبر بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ سوسائٹی اس سے کہتی ہے کہ تم اپنے مال میں سے بقدر ضرورت اپنے پاس رکھ کر باقیماندہ سوسائٹی کے فنڈ میں جمع کرا دو۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسے جبر کہا جائے گا؟ یہ اس صورت میں جبر کہلا سکتا تھا اگر اس شخص کو زبردستی سوسائٹی کا ممبر بنا لیا جاتا۔ جو شخص بطیب خاطر اس سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے وہ اس کے قواعد وضوابط کی اطاعت بطیب خاطر کرتا ہے۔ مومن کہتے ہی اسے ہیں جو بطیب خاطر اسلام قبول کرے۔ اس کے اس فیصلہ کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے قواعد وضوابط کی اطاعت بطیب خاطر کرتا ہے۔

ہمیں قرآن کے اس قسم کے مطالبات میں جبر اس لئے دکھائی دیتا ہے کہ ہم بہ طیب خاطر، سمجھ سوچ کر مسلمان نہیں ہوئے ہیں اس کا کبھی خیال تک بھی نہیں آتا کہ اسلام ایک سوسائٹی ہے جس کی ممبر شپ کی کچھ شرائط ہیں۔ ہم ان شرائط کو (جو قرآن کے اندر درج ہیں) پڑھتے ضرور ہیں (کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ان شرائط کے پڑھ لینے سے "ثواب" ہوتا ہے) لیکن ان میں سے جسے چاہتے ہیں پورا کر دیتے ہیں اور جس سے جی چاہتا ہے اعراض برت لیتے ہیں۔ یہ خیال ہمارے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں گذرتا کہ ان شرائط کی پابندی نہ کرنے سے ہم اس سوسائٹی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔

لیکن جب (اور جہاں) اسلام ایک نظام کی شکل میں قائم ہوگا، اُس وقت صورتِ حالات یہ نہیں رہے گی۔ اُس وقت جو شخص (اس سوسائٹی کے قواعد وضوابط کے مطابق) بطیب خاطر اس کا ممبر ہوگا اسے ان شرائط کو پورا کرنا ہوگا اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسے کسی صورت میں بھی جبر نہیں کہا جا سکے گا کیونکہ اس سوسائٹی کی ممبر شپ میں زبردستی نہیں ہوگی یہ بہ طیب خاطر ہوگی۔ لا اکراہ فی الدین سے یہی مفہوم ہے۔ جو سوسائٹی اس قسم کے ممبروں پر مشتمل ہوگی اس میں ہر ممبر اپنی محنت کی کمائی سے اپنی ضروریات کے بقدر اپنے پاس رکھے گا اور باقی سب کچھ سوسائٹی کے سپرد کر دے گا تاکہ اس سے دیگر افرادِ انسانیہ کی نشوونما کی جا سکے۔ جو اس شرط کو اپنے لئے ناگوار سمجھے اسے اجازت ہوگی کہ وہ سوسائٹی کی ممبر شپ سے استعفےٰ دے کر الگ ہو جائے۔

یہ بات بالکل صاف ہے لیکن ہم سے دانستہ سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ اسلام کے موجودہ تصور میں بڑی گنجائش ہے۔ اس میں کہا یہ جاتا ہے کہ ہم نے اپنی جان اور مال اللہ کے ہاتھ بیچ رکھا ہے۔ جب اللہ اسے طلب کرے گا ہم اسے اُسکے حوالے کر دیں گے۔ اس معاملہ میں کسی دوسرے کو حق حاصل نہیں کہ وہ ہم سے کسی قسم کی بازپرس کرے۔ یہ ہمارا اور ہمارے خدا کا معاملہ ہے وہ جانے اور ہم۔ کسی اور کو اس میں مداخلت کا کیا حق ہے؟ یہ کچھ اس دھڑلے سے اس لئے کہدیا جاتا ہے کہ ہمیں

معلوم ہے کہ اللہ میاں خود آکر کبھی ہمارا مال اور جان ہم سے طلب نہیں کریں گے۔ نہ وہ مانگنے آئیں گے اور نہ اسے دینا پڑے گا لیکن آخرت میں جاکر ہم اس سے جنت مانگ لیں گے کیونکہ اس نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ہم اللہ میاں سے کہدیں گے کہ ہم نے اپنا مال اور جان (جسے ہم نے آپ کے ہاتھوں بعوض جنت فروخت کیا تھا) تیار رکھا تھا کہ آپ آئیں اور ہم اسے آپ کے حوالے کردیں۔ آپ تشریف نہیں لائے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ جنت (بطور قیمت فروخت) ہمارا حق ہے۔ اسے عطا فرمائیے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس قسم کی خرید و فروخت کے معاملہ میں کس قدر "موج" ہے۔ فروخت کردہ شے کبھی خریدار کے حوالے نہیں کرنی پڑتی اور اس کی قیمت وصول کرلی جاتی ہے! لیکن قرآنی نظام میں یہ "موج" باقی نہیں رہتی۔ اس میں فروخت کردہ شے سچ مچ خریدار کے سپرد کرنی پڑتی ہے اور قیمت صرف اسے ملتی ہے جو اس شے کو اس طرح خریدار کے حوالے کردے۔ ہم دین کے اس تصور سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ ہم مفت کی جنت (اقبال کے الفاظ میں "بہشتے فی سبیل اللہ" یا "بخشے ہوئے فردوس") لینے کے خوگر ہوچکے ہیں اور جو شخص ہمیں اس لذت آفریں فریب نفس سے نکالنا چاہے اسے اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔

قرآنی نظام ربوبیت میں جبر کا اعتراض اسی ذہنی کیفیت کا پیدا کردہ ہے۔

ضرورت

ایک سابق فوجی ۳۹ سالہ حولدار کلرک کو جو مختلف شعبوں میں بائیس سال تک کلرک رہ چکے ہیں، ملازمت کی تلاش ہے۔ ٹائپنگ بھی جانتے ہیں۔ اس پتہ پر لکھیں:۔

ڈاکٹر ایم۔ ڈبلیو خاں۔ شاہدرہ موڑ۔ لاہور

ادارہ طلوع اسلام کا اہم پمفلٹ

"ہماری تاریخ"

شائع ہوچکا ہے

بزمیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسے منگوائیں۔ مزید برآں جو اہم پمفلٹ زیر اشاعت ہیں ان کے لئے اپنی اپنی ضرورت سے مرکز کو اطلاع دیں۔ تاکہ شائع ہوتے ہی بلا تاخیر ان کی ترسیل ہوجایا کرے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

رسول اللہ کی وفات کے صرف ۲۵ سال بعد اسلامی مملکت کے دار الخلافہ مدینہ منورہ کے اندر

خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ دن دہاڑے شہید کر دیئے گئے

اس کا ذمہ دار کون تھا؟

ایک اہم اور نازک سوال کا محققانہ جواب

مصر کے نامور نابینا مؤرخ

ڈاکٹر طہٰ حسین

کی شہرۂ آفاق تصنیف

الفتنۃ الکبریٰ

میں ملیگا

جس کا اردو ترجمہ چھپ کر شائع ہو گیا ہے

قیمت مجلد گرد پوش :- چھ روپے

ملنے کا پتہ :- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵- بی۔ گلبرگ ، لاہور

حقائق و عِبر

تیر و نشتر پچھلے دنوں صدر مملکت جنرل محمد ایوب خاں نے ریڈیو پاکستان کے نمائندے سے انٹرویو کے دوران میں ــــ پاکستان کے اقتصادی مسائل ــــ نامی کتاب اور اس کے مصنف کو خراج تحسین پیش کیا اور اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کا کاروبار چلانے والے سرکاری ملازمین کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے اور وہ مرکزی و صوبائی حکومت کے علاوہ مسلح افواج کے سربراہوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے ملازمین میں اس کتاب کو وسیع پیمانے پر تقسیم کرنے کا انتظام کریں۔

صدر مملکت کے مذکورہ بیان کی اشاعت پر لاہور کے روزنامہ تسنیم نے اپنی ۲۷ جون کی اشاعت میں جو اداریہ سپرد قلم کیا اس کے درج ذیل اقتباس کو بغور پڑھیے۔

> "ہم صدر ایوب کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس ملک میں ایک اور "کتاب" بھی ہے جس کی طرف انھیں توجہ کرنا اور سرکاری ملازمین کو اس کا مطالعہ کرنے کی تلقین کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل کا تجزیہ کرتی ہے بلکہ ان کا ایسا حل پیش کرتی ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے اور سنجیدگی و اخلاص کے ساتھ اس سے رہنمائی حاصل کی جائے تو قوم ہم جیسی ترقی کی فلک رس بلندیوں تک پہونچ جاتی ہے۔ یہ کتاب ایسی نہیں کہ تجربہ گاہِ حیات میں ابتک لائی نہ گئی ہو۔ بلکہ اس سے قبل ایک مرتبہ ایک قوم نے اس پر عمل کیا تھا اور چند برسوں میں وہ چار دانگ عالم پر غالب آگئی تھی۔ اس کو نہ صرف سیاسی عروج حاصل ہو گیا تھا بلکہ سماجی اعتبار سے وہ نہایت پاکیزہ اور مطمئن تھی۔ اقتصادی لحاظ سے نہایت خوش حال اور اخلاقی اعتبار سے وہ نہایت بلند تھی۔ اس کی زندگی کے تمام مسائل نہایت حسن و خوبی سے حل ہو گئے تھے۔
>
> اس کتاب کا جن لوگوں نے نظرِ غائر سے مطالعہ کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ وہ ایک "شاہ کلید" ہے

زندگی کے جس قفل کو لگائی جاتی ہے وہ فوراً کھل جاتا ہے۔

یہ کتاب قرآن مجید ہے

جسے زندگی کے خالق نے تصنیف کر کے اپنے محبوب ترین بندے اور کامل ترین انسان کے ذریعے نوعِ انسانی کو عطا کیا۔ اور اس میں زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے اصولی تجاویز پیش کر دی گئیں۔ وہ نہ صرف زرعی کمیشن کی رہنمائی کر سکتی ہے بلکہ تعلیمی کمیشن، آئینی کمیشن، قانونی کمیشن الغرض سب کمیشنوں کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اگر صدر محمد ایوب اس کے متعلق بھی ہدایات جاری کر دینگے کہ کرسی اور صوبائی حکومتوں کے اعلیٰ افسر اور فوجی سربراہ اس کا مطالعہ کریں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان کے تمام دلدر دور ہو جائیں گے اور صدر ایوب کو دنیا اور آخرت کی سرخروئیاں حاصل ہوں گی۔"

معاصر تسنیم کے اس اداریہ کے دو پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک پہلو کے متعلق، کراچی سے شائع ہونے والے (انگریزی) معاصر "ڈان" نے اپنی ۱۱ر جولائی کی اشاعت میں اداریہ سپردِ قلم کیا ہے جسے ہم اردو دان طبقہ کے افادہ کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔

آزادی کا ناجائز فائدہ

پچھلے دنوں صدر محمد ایوب خان نے ایک ریڈیو انٹرویو میں "پاکستان کے اقتصادی مسائل" نامی کتاب کی تعریف کی۔ کتاب کے مصنف مسٹر عنایت حسین کا اس سے قبل بہت کم لوگوں کو تعارف حاصل تھا۔ کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر سربراہِ مملکت کی طرف سے یہ خراجِ تحسین دفتری نظام کی فرسودہ روایات سے ہٹ کر ایک نئی طرح ڈالنے کے مترادف تھا اور ہر حلقے میں اسے خوش آمدید کہا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے ایک روزنامے کے لئے جو سابق جماعت اسلامی کا ترجمان ہے یہ بات ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی اور اس نے اپنے ۷ر جون کے اداریے میں مسٹر عنایت حسین کے بارے میں صدر کے تحسین پر اجمالی تبصرے کے بعد یہ لکھا (آگے تسنیم کے اداریہ کا وہ اقتباس ہے جو ابھی آپ نے پڑھا)

اس تبصرہ میں جو طنز و تشنیع پائی جاتی ہے وہ اتنی ہی واضح ہے جتنی اس کی شرانگیزی۔ مقالہ نگار یہ تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ گویا اس نے پہلی بار قرآن حکیم کا انکشاف کیا ہے اور صدر مملکت کو اس انکشاف سے یوں خبردار کر رہا ہے گویا انھیں اس (کتاب اللہ) کی موجودگی کا کوئی پتہ ہی نہیں۔ اس سے بھی بدتر حقیقت یہ ہے کہ مقالہ نگار نے قرآن کو ایک انسانی کتاب کے مقابلے میں لا کر اس کے مقام بلند سے پست سطح پر لانے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ایسی حرکت قرآن کریم کی توہین قرار پائے گی۔ حیرت انگیز بات یہ

> ہے کہ قرآن کی توہین کا یہ ارتکاب ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے جو مذہبی بصیرت کے مدعی ہیں۔ اس سے ان کا مقصد اس حکومت کے خلاف جسے وہ ناپسند کرتے ہیں سیاسی مفاد حاصل کرنا ہے خواہ اس سے قرآن کی توہین ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اخبار مذکور کی اس منطق کو صحیح تصور کر لیا جائے تو پھر کسی مسلمان کو بھی زندگی اور معاشرے کے متعلق نہ تو کچھ لکھنا چاہیئے اور نہ ہی اس کے حل کے متعلق کچھ سوچنا۔ واضح رہے کہ یہی اخبار مولانا مودودی اور سابق جماعت اسلامی کے دیگر اہل قلم کی تصنیفات کی تعریفیں بھی کیا کرتا ہے اور ان کے نشر و اشاعت کے فریضہ کی ادائیگی بھی۔ ان سے کوئی پوچھے کہ جب کرنے کا کام اتنا ہی ہے کہ لوگوں سے کہا جائے کہ وہ قرآن کا مطالعہ کریں تو ان شریف آدمیوں کو کتابیں اور پمفلٹ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ معاصر مذکور کا قرآن کریم کو اس بحث میں گھسیٹنے سے مقصد قرآن کی تعظیم نہیں بلکہ صدر مملکت کی تضحیک ہے۔ صدر مملکت کے خلاف اس قسم کے شر انگیز، طعن و تشنیع پر مبنی خیالات کی اشاعت اخبارات کی اُس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے مترادف ہے جس کا موجودہ انقلابی حکومت دانشمندانہ احترام کر رہی ہے۔

معاصر ڈان نے ان لوگوں کی ذہنیت اور نفسیات کا کس قدر صحیح جائزہ لیا ہے۔ معاصر تسنیم کے اداریہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو کچھ اس میں قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ کے متعلق واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے، طلوع اسلام بیس برس سے مسلسل اسی دعوت کو عام کر رہا ہے۔ ہم تسنیم کے ارباب لبست و کشاد سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ آخر یہ کیوں ہے کہ 'حسبنا کتاب اللہ' کی اسی دعوتِ ایمانی کی پکار جب 'طلوع اسلام' کی طرف سے بلند ہو تو وہ ان کے نزدیک "مردود و مقہور" قرار پا جاتا ہے۔ کیا ہمارا "جرم عظیم" ہمیشہ یہی نہیں سمجھا گیا کہ ہم مسلسل یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ "یہ کتاب ایک شاہ کلید ہے اور زندگی کے جس قفل کو لگائی جاتی ہے وہ معاً کھل جاتا ہے۔" کیا ہماری وجہ رسوائی ہمیشہ یہی نہیں قرار دی گئی کہ ہم یہ کیوں پکارتے ہیں کہ "اس (قرآن) میں زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے اصولی تجاویز پیش کر دی گئی ہیں؟" کیا ہم نے ہمیشہ یہی نہیں کہا کہ اس کے سمجھ لینے سے پاکستان کے تمام دلدّر دور ہو جائیں گے؟

لیکن کس قدر الم انگیز یہ تماشا ہے کہ ایک طرف وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر طلوع اسلام کے مسلک و مقصد کی اس طرح تائید کی جاتی ہے اور قرآن مجید کے متعلق وہی عقیدہ پیش کیا جاتا ہے جو طلوع اسلام مدت العمر سے پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ پھر جب اپنی مصلحتیں سامنے آتی ہیں تو پھر طلوع اسلام کو بھی ہدف طعن و تشنیع بنایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اسی کتاب اللہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ ناتمام ہے۔ نامکمل ہے۔ مبہم ہے۔ نہ یہ کتاب پاکستان کے آئین کی بنیاد بن سکتی ہے اور نہ یہاں کے قوانین کا مدار اس پر رکھا جا سکتا ہے۔

حیرت ہے کہ انسان کی مصلحت کوشیاں اسے کہاں کہاں تک لے جاتی ہیں۔ لیکن ہم ان حضرات سے کھلے الفاظ

میں کہتے ہیں کہ آپ حسب مصلحت جو ضروری سمجھئے کیجئے لیکن اس حقیقت کو یاد رکھیئے کہ زمانے کے تقاضے دربدر کی ٹھوکریں کھلانے کے بعد بالآخر مجبور کر دیں گے کہ آپ پورے خلوص سے قرآن کے باب عالی پر دستک دیں۔ اس لئے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

۲۔ شاہ سعود کا قابلِ گرفت جُرم

(سابق) جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ تسنیم کی ۳؍ جولائی کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

لندن کے اخبار آبزرور نے سعودی عرب کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض ایسی باتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ابھی تک پریس میں شاذونادر ہی آئی ہیں۔ آبزرور لکھتا ہے کہ حجاز میں غلاموں کی تجارت بہت ترقی پر ہے۔ یہ غلام یا تو افریقہ سے آتے ہیں یا بلوچستان اور ایران کے مفلوک الحال باشندے اپنی کثیر اولاد میں سے بعض کو فروخت کر دیتے ہیں۔ آبزرور کی روایت کے مطابق مردوں اور لڑکیوں کی قیمتیں ستر ہزار روپے سے لے کر سات لاکھ روپے تک ہوتی ہے۔ آبزرور نے اعتراف کیا ہے کہ ان غلاموں کے ساتھ حجازی خریداروں کا سلوک اچھا رہتا ہے۔ ایک بات آبزرور نے یہ لکھی ہے کہ ریاض اور دوسرے علاقوں میں کثیر رقم صرف کر کے محلات اور دفاتر تیار کیے جا رہے ہیں۔ جبکہ ان دفتروں کے تمام کمروں کو استعمال بھی نہیں کیا جاتا۔ شاہ سعود کا جو محل تعمیر ہو رہا ہے اس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس پر کوئی پندرہ بیس کروڑ روپے لاگت آئے گی۔ ایک طرف اسراف کا یہ عالم ہے دوسری جانب سعودی عرب کے شہروں میں گداگر ہجوم در ہجوم نظر آتے ہیں۔ جن کے پیٹ بھوک سے پچکے ہوئے اور چہروں پر فاقہ کشی کے آثار جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ آبزرور نے جو بات بالکل نئی اور حیران کن کہی ہے وہ یہ ہے کہ سعودی عرب میں کچھ اصلاحات بھی نافذ ہوئی ہیں۔ مثلاً قصاص کے طریقہ میں تبدیلی کی گئی ہے۔ یا زنا کی سزا اب رجم کی بجائے پیچھے سے گولی مار دی جاتی ہے۔

جہاں تک سعودی عرب میں غلامی کے فروغ۔ قصروں اور عالی شان عمارتوں کی تعمیر پر دولت کے ضیاع اور ملک میں گداگروں اور فاقہ کشوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا تعلق ہے اس کے متعلق پہلے بھی خبریں آتی رہی ہیں۔ اول الذکر کے متعلق تصدیق نہیں ہو سکی۔ سعودی عرب کی حکومت ہی بتا سکتی ہے کہ اس میں کس حد تک صداقت ہے۔ البتہ موخر الذکر دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ سعودی عرب کا قومی خزانہ ایسی ہی باتوں پر خالی ہو چکا ہے (جسے اب فیصل درست کرنے کی فکر میں ہیں) اور جن لوگوں کو

سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ وہاں گداگروں کی از حد کثرت ہے۔ البتہ یہ بات فی الواقع بالکل نئی ہے کہ سعودی عرب کی حکومت قصاص اور زنا کی سزا رجم میں "اصلاح" کر چکی ہے۔ کیا کسی ایک مسلمان ملک کے علماء یا حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر اسلامی شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں میں ردّ و بدل اور اصلاح کرلے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اس انکشاف کے بعد عالم اسلام کے دینی و علمی حلقوں میں لازماً اٹھے گا۔

پہلے آپ شاہ سعود کے "جرائم" کی فہرست پر نگاہ ڈالئے اور پھر یہ دیکھئے کہ ہمارے علمبردارانِ مذہب کے نزدیک ان میں سے کونسا جرم ایسا ہے جس پر گرفت کی سب سے زیادہ ضرورت سمجھی گئی ہے۔

(۱) شاہ سعود ملوکیت کا مظہر ہے۔ ملوکیت کے معنی ہیں سلطنت کا ورثہ میں ملنا۔ باپ کے بعد بیٹے کا بادشاہ بن جانا۔ اسلام میں ملوکیت کتنا بڑا جرم ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمارے اربابِ شریعت کے نزدیک یہ کوئی ایسا جرم نہیں جس پر مسلمان بادشاہوں سے کسی قسم کی بازپرس کی جائے یا سوچا جائے کہ اس کا علاج کیا ہے؟

(۲) حجاز میں غلاموں اور لونڈیوں کی بھرمار ہے۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک یہ جرم بھی ایسا نہیں جو قابلِ مواخذہ ہو۔

(۳) حجاز میں بادشاہ اپنی ذات پر اس قدر صرف کر رہا ہے اور ملک کے باشندے بھوکوں مر رہے ہیں۔ لیکن یہ جرم بھی ایسا نہیں جس کا نوٹس لیا جائے۔

قابلِ مواخذہ ہے یہ جرم کہ اُس نے رجم کی سزا میں اصلاح کیوں کر دی ہے؟

رجم کی سزا رجم کی سزا کا قرآن میں کوئی حکم نہیں۔ قرآن نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے۔ رجم (سنگسار کرنے کی سزا یہودیوں میں تھی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کے علی الرغم، سنگساری کی سزا ہم میں کہاں سے آگئی یہ قصہ دلچسپ ہے۔ غور سے سنئے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

> موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کی۔ یاد کی، اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضے کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق ہے اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ، خواہ مرد ہو یا عورت، جبکہ اس کے زنا پر شرعی دلیل ہو یا حمل ہو یا اقرار ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مطول ہے مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ ہم قرآن میں

نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو کہ خود رسول اللہؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپؐ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔

اس سے آگے ہے۔

ابو یعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زید بن ثابت بھی تھے۔ آپ نے فرمایا ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زناکاری کریں تو انھیں ضرور رجم کردو۔ مروان نے کہا پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا سنو ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا میں تمہاری تشفی کر دیتا ہوں ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپؐ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا یا رسول اللہؐ آپ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب تو میں اسے لکھ نہیں سکتا، یا اسی کے مثل۔

رجم کی سزا کے متعلق تو بعد میں سوچئے گا پہلے یہ دیکھئے کہ ان احادیث کی رُو سے خود قرآن کریم کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ ان احادیث میں مذکور ہے کہ رجم کے حکم کی آیت خدا کی طرف سے نازل ہوئی۔ اس کی تلاوت ہوتی تھی۔ یہ قرآن میں موجود تھی لیکن بعد میں اس میں نہ رہی اور حضرت عمرؓ نے اس کا یقینی علم رکھنے کے باوجود اسے قرآن میں داخل نہ کیا (بلکہ خود رسول اللہ نے بھی داخل نہ کیا!) قرآن میں تو یہ داخل نہ کی جا سکی لیکن حکم اس کا باقی رہا۔ اس سے ظاہر ہے کہ موجودہ قرآن (معاذ اللہ) ناقص او نامکمل ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ آیت (جو قرآن میں موجود تھی) بالآخر گئی کہاں۔ اس کا حال بھی سن لیجئے۔ سنن ابن ماجہ صحاح ستہ کی ایک کتاب ہے۔ اس کے باب رضاع الکبیر (صـ۱۴۱) میں لکھا ہے کہ

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آیتِ رجم اور آیت رضاعت کبیر ایک صحیفے میں تھیں میرے تخت کے نیچے۔ جب رسول اللہؐ وفات پاگئے تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہوگئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو بکری آگئی اور اس صحیفے کو کھا گئی۔

معاذ اللہ! معاذ اللہ!

یہ ہے رجم کی سزا کی سند جس کی اصلاح پر ہمارے یہ ارباب شریعت اس طرح پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔

اب رہا یہ اصولی سوال کہ دین کے معاملہ میں کسی کو رد و بدل کرنے کا کیا حق حاصل ہے تو اس کے متعلق قرآن کریم کا فیصلہ ہمارے سامنے ہے۔ یعنی

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں

بات صاف ہے لیکن ہمارے ارباب شریعت خدا کے اس فیصلے کو ماننے کے لئے کب تیار ہو سکتے ہیں۔ جب خود ان کی مروجہ شریعت کے متعدد فیصلے ایسے ہیں جو صریحاً قرآن کے خلاف ہیں۔ مثلاً یہی رجم (سنگسار کرنے) کا فیصلہ!

---x---

قرآن۔ اپنوں اور غیروں کی نظر میں

ہفتہ وار صدق (لکھنؤ) کے مدیر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے "سچی باتوں" کے عنوان سے لکھا ہے۔

برٹانیکا کو چھوڑ کر بھی، پچاسوں سینکڑوں اہل علم کی کوشش سے انسائیکلوپیڈیا انگریزی زبان میں نکلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ حال میں سرجان ہمرٹن کے زیراہتمام متوسط تقطیع کی یونیورسل انسائیکلوپیڈیا گیارہ جلدوں میں نکلی ہے۔ ہر صفحہ میں چار کالم ہیں۔ چھٹی جلد میں مضمون، ایک کالم سے کچھ اوپر کا، قرآن پر ہے اور ہر طرح سنبھلا ہوا ہے۔ غیروں کے لکھے ہوئے اس مضمون کے بعض فقرے اپنوں کے بھی سننے کے لائق ہیں۔

"یہ کتاب پیمبر محمدؐ پر ان کی زندگی کے آخری ۲۳ برسوں تک مکہ و مدینہ میں وحی سے نازل ہوتی رہی اور مسلمانوں کے عقیدہ میں کلام الٰہی ہے۔ برخلاف حدیث کے جو مجموعہ کلام رسول ہے۔"

یہ تعارف بہت ہی غنیمت ہے۔ ورنہ خیال تو اس قسم کے تعارف تھا کہ یہ وہ کلام محمدؐ جسے انہوں نے کلام الٰہی کہہ کر پیش کیا۔

"قرآن پیمبرؐ کی زندگی ہی میں اور انہیں کی زیر ہدایت و نگرانی ضبط تحریر میں آگیا تھا اور ان کے صحابیوں نے اسے زبانی حفظ کر لیا تھا اور یہ معمول آج تک جاری ہے چنانچہ صدہا مسلمان کلام پاک کے حافظ ہیں۔ اور اسے سارے کا سارا دہرا سکتے ہیں بغیر کسی ایک غلطی کے۔"

مضمون نگار کو اگر ذرا گہری واقفیت ہوتی تو دنیائے اسلام میں موجودہ حافظوں کی تعداد بجائے سینکڑوں کے دہ لاکھوں درج کرتا۔

"بارہا ایسا ہوا کہ ایک سورت کا نزول ابھی ختم نہیں ہوا کہ دوسری سورت نازل ہونے لگی، پھر ترتیب خود ہی پیمبرؐ ہی کے حکم سے قائم ہوئی تھی۔ نئی آیتیں جب نازل ہوتی تھیں آپ قرآن کے کاتبوں کو بلا کر کہہ دیتے تھے کہ ان آیتوں کو فلاں فلاں آیتوں کے متصل لکھ لو۔"

تدوین قرآن سے متعلق یہ غیر مسلم کتنے ہی مسلموں سے زیادہ علم صحیح اور فہم سلیم رکھتا ہے۔ "قرآن نثر مقفیٰ میں ہے اور اس کا بہترین عربی ادب ہونا سب کو مسلم ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں تمام کتب آسمانی کے حقائق آگئے ہیں اور یہ کہ وہ آخری اور ناقابل تغیر کتاب ہے، نیز یہ کہ نوع انسانی کے لئے وہ جامع ترین دستور العمل ہے اور اسلام یعنی دین فطرت کی آخری توضیح ہے اور یہی دین ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور سارے قدیم انبیاء کا رہ چکا ہے۔"

اور سب سے بڑھ کر یہ شہادت و تصدیق کہ

• اس کی عبارت کا غیر محرف ہونا ایک مسلّم ہے؟

کاش یہ دعویٰ کسی درجہ میں بھی کسی دوسری کتاب آسمانی کے حق میں کیا جا سکتا!

(بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۵۹/۷ ص ۴۲)

طلوعِ اسلام:- قرآن کریم کی صحت اور اس کے غیر محرف ہونے کے متعلق اس سے پہلے بھی کئی ایک غیر مسلم مؤرخین اور محققین اعتراف و اعلان کر چکے ہیں۔ ان شہادات میں یہ نئی شہادت ایک اچھا اضافہ ہے۔ جس کی اشاعت پر مدیر صدق نیک اجر کے مستحق ہیں۔ اے کاش! ان "سچی باتوں" کے لکھنے والے کو اتنا اور سچ بولنے کی توفیق مل جاتی کہ اسی قرآن کے متعلق خود ہماری کتب احادیث میں کیا لکھا ہے؟ یہ روایات صحاح ستہ میں موجود ہیں جن کی صحت سے (ہمارا خیال ہے کہ) مولانا عبد الماجد صاحب جرأت انکار نہیں کر سکتے۔ اگر وہ ان روایات کے لئے زیادہ ورق گردانی نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم امام عبد اللہ بن ابی داؤد کی کتاب المصاحف ہی دیکھ لیں جن میں ان روایات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان روایات کی رُو سے قرآن کریم کو نہ نبی اکرمؐ نے جمع اور مرتب کرایا تھا اور نہ ہی کتاب کی شکل میں امت کو دیا تھا۔ بلکہ

امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زید بن ثابت سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہل یمامہ کا قتل ہوا ابو بکرؓ نے مجھے آدمی بھیجکر بلایا۔ وہاں عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابو بکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو؟ عمرؓ نے کہا بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارے میں مجھ سے برابر کہتے رہے حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرح صدر کر دیا تھا میرا بھی شرح صدر کر دیا اور میری رائے بھی وہی ہو گئی جو ان کی تھی۔ ابو بکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقلمند آدمی ہو اور رسول اللہ صلعم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے۔ لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ اگر بخدا وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابو بکرؓ اور ابو بکرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے۔ حتیٰ کہ جس امر کے لئے ان دونوں کو شرح صدر ہو چکا تھا مجھے بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی میری رائے بھی ہو گئی جو ان دونوں کی تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظہ) سے تلاش کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ایک آیت جو میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی۔ یعنی لقد جاءکم رسول

من انفسکم (الآیہ) چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا یا لاخر خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اسکو اسکی صورت میں لکھ دیا۔

دوسری روایت میں ہے کہ جمع القرآن کا کام ابوبکرؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں شروع کرایا تھا لیکن وہ مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ آپ شہید ہو گئے۔ آپ کے بعد اسے حضرت عثمانؓ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ لیکن

امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر قرشی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہو گئے اور انھوں نے اسے دیکھا تو فرمایا تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر اس میں کچھ غلطیاں مجھے نظر آتی ہیں جنھیں عرب لوگ اپنی زبانوں سے ٹھیک کر لیں گے۔

اس سے ذرا آگے ہے۔

عروہ کہتے ہیں کہ قرآن کی غلطیوں کے متعلق میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا۔ ان ھذان لساحران اور والمقیمین الصلوٰۃ والمؤتون الزکوٰۃ اور والذین ھادوا والصابئون کے متعلق سوال تھا حضرت عائشہؓ نے کہا۔ بھتیجے یہ کاتبوں کا کام ہے کہ انھوں نے لکھنے میں غلطی کر ڈالی۔

اسکے بعد انھوں نے تفصیلاً (بااسناد) لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مرتب کردہ قرآن اہل مدینہ کے مصاحف سے کم از کم بارہ مقامات میں مختلف تھا اور اس مصحف کی جو نقول دوسرے شہروں میں بھیجی گئیں وہ ایک دوسرے سے قریب چالیس مقامات میں مختلف تھے۔ ازاں بعد حجاج بن یوسف نے اپنے زمانے میں قرآن کا نسخہ مرتب کیا جو حضرت عثمانؓ کے نسخہ سے گیارہ مقامات پر مختلف تھا۔ (اور یہی نسخہ آج ہمارے ہاں مروج ہے)

یہ تو رہی قرآن کے متن اختلافات کی کیفیت۔ اس کے (معاذاللہ) ناقص و نامکمل ہونے کے متعلق ہم سابقہ عنوان میں بتا چکے ہیں کہ کس طرح آیۂ رجم قرآن میں داخل ہونے سے رہ گئی اور اُسے (پناہ بخدا) حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی۔ تفسیر ابن کثیر میں (متعدد روایات کے حوالے سے) یہاں تک بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ قرآن کے نسخوں سے معوذتین (قرآن کی آخری دو سورتیں) مٹا دیا کرتے تھے کیونکہ وہ انھیں قرآن میں داخل نہیں سمجھتے تھے۔ اور حضرت ابی بن کعب بھی ان کے ہم خیال تھے۔

ہم محترم عبدالماجد صاحب سے آتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جب اس قدر روایات (جو احادیث کی معتبر ترین کتابوں میں درج ہیں) قرآن کے متعلق یہ شہادت دیتی ہیں تو آپ ان کے مقابلہ میں ایک غیر مسلم کی شہادت کو صحیح قرار دیکر انکار حدیث کے جرم کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ آپ فرمائیے تو سہی کہ ان کتب روایات کے متعلق جن میں یہ احادیث درج ہیں۔ (اور جن میں بخاری تک بھی شامل ہے) آپ کا اور آپ کے ساتھ دیگر علمائے کرام کا کیا عقیدہ ہے؟

---x---

جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب

پر

ادارہ طلوعِ اسلام

کا

گراں بہا تحفہ

معراجِ انسانیت

(سیرتِ نبی اکرمؐ قرآن کریم کے آئینہ میں)

بتیس۳۲ روپے

کی بجائے

پندرہ۱۵ روپے

فرمائش بھیجنے میں دیر نہ کیجئے

لوگوں کو دھوکا نہ دیجئے

(المنبر۔ لائلپور سے خطاب)

لائلپور کے ہفتہ وار اخبار المنبر نے اپنی ۲۴/۱۷ مارچ کی اشاعت میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کے تمام گروہ حدیث کو دینی حجت تسلیم کرتے ہیں۔

> البتہ اختلاف یہاں آ کر رونما ہوتا ہے کہ فلاں حدیث کا انتساب رسولِ برحق کی جانب درست ہے یا نہیں۔

اس پر محترم پرویز صاحب[1] نے اپنے کنونشن کے خطبہ میں کہا تھا کہ جب احادیث کی پوزیشن یہ ہے کہ ان کے معانی و مطالب ہی میں نہیں بلکہ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ جس حدیث کو ایک شخص بطور سند و حجت پیش کر رہا ہے وہ رسول اللہؐ کی ہے بھی یا نہیں۔ تو انھیں اُس آئینِ پاکستان کی بنیاد کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے جس کا اطلاق پاکستان کے تمام مسلمانوں پر متفقہ طور پر ہوگا۔ یہ بات ایسی صاف تھی کہ اگر اس پر خالی الذہن ہو کر تھوڑا سا بھی غور کر لیا جاتا تو حقیقت واضح ہو جاتی۔ لیکن فرقہ پرستی کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس میں کوئی فرقہ اپنے مسلک کے متعلق خالی الذہن ہو کر سوچنے کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ معاصر المنبر نے اپنی ۱۰/۳ جولائی کی اشاعت میں، اس کے خلاف ایک طویل مقالہ سپردِ قلم فرما دیا (جس کی پہلی قسط ابھی ہمارے سامنے آئی ہے)، اس میں اس نے لکھا ہے کہ

> صورتِ واقعہ یہ ہے کہ احادیث کی بنیادی کتابوں کی تقریباً نناوے فیصد احادیث امّت کے زدوں میں صحیح احادیث تسلیم کی جاتی ہیں۔ یعنی یہ بات مسلّم ہے کہ یہ احادیث رسول اللہؐ کی احادیث

---

[1] ہم المنبر پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ پرویز صاحب طلوعِ اسلام کے مدیر نہیں۔

ہی ہیں ـــــ مثلاً بخاری شریف، جس کی کل احادیث ...... [1] ہیں۔ اور ان میں سے اگر مکررات حذف کر دی جائیں تو بخاری کی احادیث کی تعداد ...... [1] ہے۔ ان تمام احادیث کی صحت کے بارے میں (بجز پانچ یا ان کے لگ بھگ چند ایک احادیث کے) پوری امت متفق ہے۔ حنفی۔ مالکی۔ شافعی۔ حنبلی۔ اہل حدیث۔ یہ تمام گروہ بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں۔

اگر پوزیشن فی الواقعہ یہی ہو جو المنبر نے بیان کی ہے تو اس سے زیادہ خوشی اور اطمینان کی بات اور کون سی ہو سکتی ہے؟ اس سے اس اہم مشکل اور پیچیدہ ترین مسئلہ کا حل آسانی سے مل سکتا ہے جس نے ملت کے بہی خواہ اور سنجیدہ اہل فکر طبقہ کو وقفِ اضطراب کر رکھا ہے۔ یعنی فرقہ پرستی کا حل ـــــ لیکن آئیے دیکھیں کہ پوزیشن فی الواقعہ یہی ہے، یا المنبر نے "مناظرہ جیتنے کی خاطر" وہی پرانا حربہ استعمال کیا ہے؟

پہلے تو یہ دیکھئے کہ المنبر کے بیان کے مطابق، بخاری کی تمام احادیث کی صحت کے بارے میں (بجز پانچ یا ان کے لگ بھگ احادیث کے) پوری امت متفق ہے۔ سوال یہ ہے کہ "امت" میں شیعہ فرقہ بھی شامل ہے یا نہیں؟ اگر شامل ہے تو کیا شیعہ حضرات بھی بخاری کی احادیث کو صحیح احادیث تسلیم کرتے ہیں؟

اور آگے بڑھئے۔ المنبر نے جن فرقوں کا نام لیا ہے۔ ان میں سے پاکستان میں حنفی حضرات کی اکثریت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حنفی حضرات کے نزدیک بھی بخاری کی یہی پوزیشن ہے جو اوپر بتائی گئی ہے۔ اس کے متعلق ہم خود بھی بہت کچھ لکھ سکتے تھے لیکن ہم نے مناسب سمجھا کہ اس ضمن میں کوئی مستند بیان پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے، حنفی مکتب کے ایک جید عالم، محترم مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، صدر مدرس جامعہ اشرفیہ، ٹنڈو الہ یار کی خدمت میں پورا واقعہ لکھنے کے بعد ان سے دریافت کیا کہ حنفی حضرات کے نزدیک بخاری کی احادیث کی پوزیشن کیا ہے۔ ان کا جواب من وعن درج ذیل کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
>
> جی ہاں حنفیہ کے نزدیک بھی کتاب البخاری ومسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہیں اور مسلم پر بخاری کو ترجیح ہے مگر اس سے وہ مواضع مستثنیٰ ہیں جن پر دارقطنی وغیرہ محدثین نے تنقید کی ہے کہ ان کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ محل اختلاف ہیں۔ دارقطنی وغیرہ نے تقریباً دو سو احادیث پر تنقید کی ہے جو بخاری ومسلم میں موجود ہیں۔ ان مواضع کے سوا بقیہ کی صحت پر اتفاق ہے۔ صرح بہ الحافظ ابن حجر فی مقدمۃ الفتح صـ ۳۴۴ وابن خلدون المؤرخ فی مقدمۃ تاریخہ واللہ اعلم۔
>
> (ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ۔ ۸ محرم ۱۳۷۹ھ)

---

[1] ان دونوں جگہوں میں جریدہ مذکور نے جگہ خالی چھوڑ دی ہے

المنبر کا دعویٰ تھا کہ پانچ یا اس کے لگ بھگ احادیث کے علاوہ بخاری کی تمام احادیث کو حنفی حضرات صحیح تسلیم کرتے ہیں اور مولانا نے عثمانی کا ارشاد ہے کہ بخاری اور مسلم کی دو سو احادیث ایسی ہیں جنھیں حنفی صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

ہم اپنے مؤقر ہم عصر (المنبر) کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ اس قسم کی غلط بیانیوں سے اپنی پارٹی کے لوگ تو یقیناً خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمارے لیڈر نے میدان مار لیا۔ لیکن اس طرح ان مسائل کا حل نہیں ہو سکتا جن سے اُمت کا مستقبل وابستہ ہے۔ ہم ان سے (اور انہی جیسے اور حضرات سے) باادب اور بُرزور درخواست کریں گے کہ آپ خدا کے لئے اس اندازِ فکر کو چھوڑ دیں۔ اور ایسے اہم مسائل پر سنجیدگی سے غور و تدبر کی عادت ڈالیں۔ ہم انھیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام کو نہ (معاذ اللہ) سنت رسول اللہ سے کوئی ضد ہے۔ نہ احادیثِ صحیحہ سے کوئی کدﷺ اس کے سامنے ملک اور ملت کے مستقبل سے متعلق ایک عملی سوال ہے اور وہ اس کے عملی حل کے لئے آپ حضرات کو دعوتِ غور و فکر دیتا چلا آرہا ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اس سوال پر غور و خوض کریں طلوع اسلام کو کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اور اس قسم کی غلط بیانیوں سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے "دنداں شکن" جواب دیدیا۔ وہ عملی سوال جس کا عملی حل مطلوب ہے یہ ہے کہ اگر پاکستان کے آئین و قوانین کی بنیاد کتاب و سنت کو قرار دیدیا گیا، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ بتایا جائے کہ وہ کون سی کتاب ہے جس میں رسول اللہ کی وہ سنت درج ہے جو تمام مسلمانانِ پاکستان کے نزدیک متفقہ طور پر صحیح اور قابل قبول ہو۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ آئین (جس کی بنیاد کو اس طرح غیر واضح اور غیر متعین چھوڑ دیا جائے) عملی طور پر ایک دن کے لئے بھی نہیں چل سکیگا۔

المنبر نے بخاری شریف کو ایسی کتاب کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کے متعلق (علاوہ اسکے کہ امت کا ایک بہت بڑا فرقہ یعنی شیعہ۔ اسے قطعاً قابل قبول نہیں سمجھتا۔ خود) حنفیوں کے نزدیک اسکی جو پوزیشن ہے وہ مولانا عثمانی صاحب کے خط سے آپ کے سامنے ہے۔ اب فرمایئے کہ کیا بخاری یا مسلم کو سنتِ نبویؐ کی ایسی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر واجب التسلیم ہو؟

ہم المنبر (اور اسی نہج فکر کے دیگر حضرات) سے درخواست کریں گے کہ وہ اگر واقعی دین کی خدمت اور امت کا بھلا چاہتے ہیں تو وہ اپنی گفتگو کو اس مرکزی نقطہ تک محدود رکھیں اور لوگوں کو غیر متعلقہ مباحث میں الجھا کر اس بنیادی مسئلہ سے گریز کی راہیں نہ تلاشیں۔ اور اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ فی الواقعہ سنت پر مشتمل کوئی ایسی کتاب نہیں پیش کی جا سکتی جو تمام مسلمانانِ پاکستان کے لئے یکساں طور پر واجب التسلیم ہو تو پھر آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ طلوع اسلام اس ضمن میں کیا کہتا ہے۔ اس سے بات صاف ہو کر سامنے آجائے گی۔

---x---

؎ جہاں تک پرویز صاحب کا تعلق ہے اگر یہ دیکھنا ہو کہ ان کے دل میں حضور ختمی مرتبت نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم کی عظمت و عقیدت کس طرح والہانہ طور پر موجزن ہے تو سیرۃ طیبہ پر ان کی مبسوط تصنیف 'معراج انسانیت' کو ایک نظر دیکھ لیجئے یا عید میلاد النبیؐ کی تقریب پر ان کی تقاریر ہی سن یا پڑھ لیجئے۔

رابطۂ باہمی

(تمام بزمہائے طلوعِ اسلام کے نام ضروری ہدایات)

تمام بزمہائے طلوعِ اسلام کے نام اس امر کی یاددہانی ضروری سمجھی گئی ہے کہ اصولی ہدایات اور قراردادوں کے علاوہ کونشن میں بزموں کی جدوجہد کو موثر بنانے کے لئے جو اہم فیصلے ہوئے تھے (یہ فیصلے روئیداد کونشن میں شائع ہو چکے ہیں) انھیں شایانِ شان اہمیت نہیں دی گئی۔ ابھی تک کسی ایک بزم کی طرف سے ان فیصلوں پر عملدرآمد کے سلسلہ میں رپورٹ موصول نہیں ہوئی۔ ان فیصلوں کو ازسرِنو شائع کیا جاتا ہے۔ اور ہدایت کی جاتی ہے کہ ہر بزم بلاتاخیر اس سلسلے میں خصوصی رپورٹ ارسال کرے۔ اس رپورٹ کے ساتھ اراکین بزم کی فہرست، ہر رکن کے مفصل ایڈریس و تعارف اور بزم کی اہم کارگذاریوں کے ساتھ پہونچنی اشد ضروری ہے تاکہ انھیں ایک پمفلٹ کی صورت میں (حسبِ فیصلہ) شائع کرنے کی صورت پیدا ہو۔ جو بزمیں رپورٹ کے ساتھ گوشوارہ آمد و خرچ نہیں بھیجتیں آئندہ وہ باقاعدگی سے بھیجیں۔

فیصلے درج ذیل ہیں۔ انھیں بغور پڑھیئے۔ انھیں پیشِ نظر رکھ کر اپنی گذشتہ سہ ماہی تک دتنا کا محاسبہ کیجئے اور مرکز میں اپنی رپورٹ جلد از جلد ارسال کیجئے۔

فیصلہ جات کونشن

۱۔ رابطۂ باہمی کے اہم مقصد کی کامیابی کے لئے اراکینِ بزمہائے طلوعِ اسلام کی فہرست، ان کے مکمل پتوں اور تعارف کے ساتھ شائع کی جائے۔ بزموں کی کارگذاریاں بھی شاملِ اشاعت ہوں۔

۲۔ بزموں کے ارکان اپنی سیرت و کردار کو اسوۂ رسول اللہ سے قریب تر لانے میں کوشاں رہیں۔

۳۔ فکرِ قرآنی کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے کے لئے ہر رکن ہر سال بزم کے تین رکن یا طلوعِ اسلام کے تین خریدار یا تین پیشگی خریدار بنائے۔

۴۔ کونشن کے سالانہ اجتماعات کی ضروریات کے پیشِ نظر برتنوں کی طرح کرسیوں اور شامیانوں کے مسئلے کو بھی حل

کرنے کی کوشش کی جائے۔

(نوٹ) جن احباب نے کنونشن میں مختلف مدات میں عطیات کا اعلان کیا تھا اور تاحال اس وعدے کو پورا نہیں کیا انھیں مذکورہ مواعید کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔

گلاسگو (انگلینڈ) سے ایک خط

گلاسگو سے ناظم ادارہ کے نام ایک محترم اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی بزم کا ممبر بنوں۔ اور اس کی مجھے بے انتہا خوشی بھی ہے لیکن اصولی ہدایات (برائے نظم و ضبط بزمہائے طلوع اسلام) میں الجھ سا گیا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہاں (یو۔ کے میں) تو طلوع اسلام کی کوئی بزم ہی نہیں اس لئے سوچا کہ بھیجوں کس بزم کو۔ شاید آپ فرمائیں کہ پاکستان میں سے جس جگہ سے آیا ہوں وہاں کی بزم یا اس کی نزدیک کی کسی بزم کو بھیج دوں۔ لیکن بندہ تو مشرقی پنجاب سے۔ لٹ پٹ کر ۱۹۴۷ء کے خونی انقلاب میں پاکستان آیا تھا جب سر چھپانے کو بھی جگہ نہ ملی تو چار سال در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد حسن اتفاق سے مجھے یہاں آنے کا موقع مل گیا۔ میں یہاں آکر پاکستان کو بھول جانا چاہتا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سمجھئے یا کچھ اور کہ یہاں ۱۹۵۵ء میں طلوع اسلام کا ایک پرچہ پہلی بار دیکھا پہلے تو اسے مذہبی پرچہ سمجھتے ہوئے ایک کونے میں پھینک دیا۔ لیکن پھر اٹھا کر دیکھنا شروع کیا تو خریدار بن گیا اور آج اس کا ممبر بننے کے لئے بے تاب ہوں اور دل مچل رہا ہے کہ پاکستان آؤں اور پرویز صاحب کو جی بھر کر دیکھ لوں۔

اپنا فارم رکنیت پر کر کے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے کسی بزم کا رکن ضرور بنوا دینگے۔

والسلام"

ادارہ طلوع اسلام نے مناسب غور کے بعد محترم مذکور کا قرطاس رکنیت بزم طلوع اسلام کراچی کو بھیج دیا ہے۔ محترم فی الحال بزم کراچی سے منسلک ہوں گے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ انگلستان کے مختلف شہروں میں طلوع اسلام کے جو قارئین موجود ہیں اور فکر قرآنی کی اشاعت میں اسی طرح ہاتھ بٹانے کا ذوق و شوق رکھتے ہیں۔ وہ سب انگلستان کے کسی مرکزی شہر میں اپنی بزم قائم کرلیں، تاکہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور نشو و ارتقاء کا کام انگلستان میں اجتماعی اور منظم طریق پر تکمیل پا سکے

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

رپورٹیں

ملتان صدر ملتان میں بزم قائم ہو چکی ہے۔ فی الحال محترم اختر حسین صاحب ایم اے ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ

نمائندہ مقرر ہوئے ہیں۔ ان کی رفاقت میں محترم نذیر احمد صاحب ایڈوکیٹ و میاں نذیر مسلم ایڈوکیٹ بالخصوص فکر قرآنی کی نشرو اشاعت میں سرگرم کار ہیں۔

(ادارہ طلوع اسلام بزم کے قیام کی توثیق کرتا ہے)

راولپنڈی بزم کے اجلاس باقاعدہ ہو رہے ہیں۔ کوہ مری کی سب کونسل اور واہ کینٹ کی بزم کی دعوت پر ہر دو مقامات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور محترم پرویز صاحب کے دیگر ٹیپ ریکارڈ سنائے گئے۔ ان خطابات نے ان مختلف اجتماعات میں بے حد اثر کیا ہے۔ پشاور شہر اور صدر کی بزموں کی دعوت پر وہاں بھی یہ ٹیپ ریکارڈ سنائے گئے۔ اب کیمبلپور اور دیگر شہروں کے معززین کی طرف سے بھی یہ دعوتیں موصول ہوئی ہیں کہ وہاں کے اجتماعات میں یہ گرانقدر ٹیپ ریکارڈ سنائے جائیں۔

پنج کسی (ضلع ملتان) گندم کی فصل سے فراغت کے بعد اراکین بزم کا حالیہ اجلاس بڑا ہی کامیاب تھا۔ اس اجلاس میں تمام ارکان حاضر تھے۔ لٹریچر کی تقسیم بھی کی گئی۔ بزم کے ارکان کے لئے بڑے نامساعد حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں لیکن بفضل خدا ہر رکن چٹان کی طرح ثابت قدم ہے۔

گوجرہ (ضلع لائلپور) بزم کا ماہانہ اجتماع ریلوے روڈ پر ہوا۔ اراکین بزم نے نظام ربوبیت کے لئے فکری جدوجہد اور نشرو تبلیغ کو سرگرمی سے جاری رکھنے کا عہد کیا۔ مختلف پمفلٹ مفت تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

ہنگو (ضلع کوہاٹ) بزم ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے کر رہی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ انتہائی جذب و شوق سے شریک کار بن رہا ہے۔ اراکین بزم کی مساعی نظام ربوبیت کو سمجھنے اور پھیلانے پر مرکوز ہیں۔ عوام بزم کے مقاصد سے خوب دلچسپی لے رہے ہیں۔

پشاور صدر اور شہر کی بزموں کے اجتماعات میں پرویز صاحب کی تقریروں کے ٹیپ ریکارڈ سنائے گئے۔ اراکین بزم کے علاوہ معززین شہر نے بھی شرکت کی اور ان خطابات سے بے حد متاثر ہوئے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ بزم پشاور اپنا ٹیپ ریکارڈ خرید لے۔

کراچی ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے درس قرآن کریم کا سلسلہ بڑی ترقی کر رہا ہے۔ یہ اجتماعات ہر اتوار کو ۹ بجے صبح نبکل روڈ پر پی ایم اے بلڈنگ کے ہال میں منعقد ہو رہے ہیں۔ ان اجتماعات کی حاضری میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اتوار کے اجتماع کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی ٹیپ شدہ تقاریر سنائی جاتی ہیں۔ تمام لائبریاں حسب معمول چل رہی ہیں۔

بزم کے حالیہ اجلاس میں رفیق عزیز محترم سبحانی مرحوم کی وفات حسرت آیات پر مرحوم

کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کیا گیا اور مرحوم کے حق میں بخلوص قلب دعائے مغفرت مانگی گئی۔

(نوٹ) بزم کراچی نے ادارہ طلوع اسلام کی ایجنسی حاصل کر لی ہے۔ لہذا کراچی میں ادارہ کا ہر قسم کا لٹریچر بزم سے مل سکتا ہے۔

مری

بزم کا اجلاس ہر اتوار کو باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ اراکین بزم کے علاوہ خاص دعوت پر دیگر معززین بھی شریک ہوتے ہیں۔ مطبوعات ادارہ کی فروخت کا معقول بندوبست کتابوں کی مختلف دوکانوں پر کیا گیا ہے۔ طلوع اسلام اور دیگر پمفلٹ بھی خاصی تعداد میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ بزم کے گذشتہ اجلاس میں اظہار خیال کے لئے احباب کو ایک موضوع دیدیا گیا تھا۔ حالیہ اجلاس میں ہر ایک نے اس موضوع پر تقریر کی۔ آئندہ اجلاس کے لئے ایک نیا موضوع دیا گیا ہے اگر دوسرے مقامات پر بھی یہ صورت پیدا کی جائے تو احباب کی فکری نشوونما بھی ہوگی اور اظہار خیال کی صلاحیت بھی اجاگر ہو سکے گی۔ بزم کا دفتر وڈلینڈ لاج کلڈنہ روڈ پر قائم کر دیا گیا ہے۔ باہر سے آنے والے احباب لٹریچر اور دیگر معلومات نواب علی انور علی کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ کی دوکان (بالمقابل پوسٹ آفس مال روڈ) سے حاصل کریں۔

شیخوپورہ

اراکین بزم فکر قرآنی کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں فرداً فرداً رابطہ قائم کر کے طلوع اسلام کے مقصد و مسلک سے معززین شہر کو روشناس کرا رہے ہیں۔ لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام کی سالانہ خریداری کے علاوہ اس ہفتے یہاں کے دو ممتاز وکلاء نے بزم کی رکنیت قبول کی۔

چنیوٹ (ضلع جھنگ)

محترم سبحانی مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر اظہار تعزیت کے لئے بزم کا ہنگامی اجلاس ہوا۔ اور مرحوم کے پسماندگان اور محترم پرویز صاحب سے ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کیا گیا۔

گوجرانوالہ

۱۰ جولائی کو بزم کا اجلاس ہوا۔ مضافات کے احباب نے بھی اجلاس میں شرکت کی۔ شیخ محمد اقبال نے "قربانی" کے موضوع پر اثر انگیز تقریر کی۔ اجلاس میں اصولی ہدایات کو احباب کے ذہن نشین کرایا گیا۔ انجمن تعمیر ملت کی لائبریری میں طلوع اسلام کا لٹریچر قارئین کے زیر مطالعہ آ رہا ہے۔ اہم مطبوعات بھی برائے مطالعہ تقسیم کی جا رہی ہیں۔ سکھیکی اور وزیرآباد میں بھی عنقریب بزمیں قائم ہو جائیں گی۔ گوجرانوالہ میں بھی اس ماہ بہت سے معززین نے بزم کی رکنیت قبول کی ہے۔

جلالپور جٹاں بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ لٹریچر کی تقسیم خوش اسلوبی سے جاری ہے۔ بزم کے ارکان اور طلوع اسلام کے خریداروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حالیہ اجلاس میں بھائی مرحوم کی وفات پر اظہار تعزیت کیا گیا اور ان کی گرانقدر خدمات کو سراہا گیا۔

(نوٹ) یہ اطلاعات انتہائی خوش کن ہیں کہ پرویز صاحب کی تقاریر کے ٹیپ شدہ ریکارڈوں کا جو سلسلہ راولپنڈی اور کراچی کی بزموں نے شروع کیا اُس نے انتہائی دور رس اور خوش آئند اثرات پیدا کئے اور ہمہ گیر نتائج مرتب کئے ہیں ان کے ذریعے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں حوصلہ افزا امداد ملی ہے اور دوسری بزمیں بھی ان سے مستفید ہو ئی ہیں۔ انہی نتائج کی بنا پر لائلپور اور لپشاور کی بزموں نے بھی ٹیپ ریکارڈز کا اہتمام شروع کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ دیگر بزمیں بھی ان درخشندہ نتائج کے پیش نظر اپنے ہاں ٹیپ ریکارڈنگ کا انتظام کریں۔ یہی وہ کامیاب صورت ہے جس کی بدولت طلوع اسلام کا قرآنی پیغام اپنے حقیقی رنگ میں ملک کے گوشے گوشے میں پہونچ سکے گا۔ قرآنی فکر کی روشنی جلد از جلد ملک بھر میں پھیل سکے گی اور قرآنی نظام کے قیام کے امکانات اُبھر ابھر کر منظر عام پر آجائیں گے۔ وبیدہ التوفیق!

ضروری انتباہ

تمام بزموں اور ان کے اراکین پر یہ حقیقت پوری شدت سے واضح کی جاتی ہے کہ ادارہ طلوع اسلام کے قرآنی مقاصد کی نشر و اشاعت میں سربسر واضح، جائز اور نیک ذرائع سے کام لیا جائے اور اس راہ میں ہر قسم کی مصلحت کوشی اور دورُخی سے اجتناب کیا جائے۔

عید میلاد النبی صلعم قریب آرہی ہے

اس لئے

تمام بزمیں اور احباب ادارہ طلوع کے پمفلٹس ـــــ (۱) مقام محمدی۔ (۲) رحمۃ للعالمین ـــــ زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگوائیں اور تقسیم کریں۔ تاکہ حضور رسالت مآبؐ کی سیرت طیبہ اور مقام نبوت اپنی حقیقی آب و تاب اور دلکشی سے نکھر کر سامنے آسکے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور